

تشریح

تشریح

تشریح

تنها تنها

---

احمد فراز

تتتتتتتت

---

احمد سراج

جملہ  
حقوق  
مہفوظ

فہرست  
مخطوطات  
مکتوبات  
مخطوطات  
مکتوبات  
مخطوطات  
مکتوبات  
مخطوطات  
مکتوبات  
مخطوطات  
مکتوبات

عنے کا پتہ

یوسف پبلشرز

بینک روڈ۔ راولپنڈی۔ صدر

مصنف : احمد سراز

پبلشر : محمد یوسف

پرنٹرز : بی۔ ایس۔ پرنٹرز۔ راولپنڈی

قیمت :

ادارہ : یوسف پبلشرز۔ بینک روڈ۔ راولپنڈی۔ صد

کتابت : محمد صدق منظر تلمیذ یوسف گینہ

قلمکار : اخبار مارکیٹ۔ کالج روڈ۔ راولپنڈی

ضیاء الدین ضیاء

کے نام

ہاں ، مگر کوئی تمنا پس امان و قاف  
مجھ سے پوشیدہ مرے پیش نظر ہوتی ہے  
(ضیاء)

# ترتیب

- ۱۔ شاعر ۲۱
- ۲۔ رباعی ۲۶
- ۳۔ تیری باتیں ہی سنائے آئے ۲۷
- ۴۔ جن کے دم سے تھیں بستیاں آباد ۳۰
- ۵۔ کھنڈر ۳۲
- ۶۔ کچھ ایسے ہم نے خرابے بسائے شہروں میں ۳۸
- ۷۔ بھول ۴۰
- ۸۔ رباعی ۴۲
- ۹۔ فرار ۴۳
- ۱۰۔ دوست جب ٹھہرے چمن کے دشمن جان بہار ۴۵

- ۱۱۔ احتساب ۴۷
- ۱۲۔ ہر ایک دل کو طلب ہر نظر سوالی ہے ۴۹
- ۱۳۔ ہر شاخ چمن کی جل رہی ہے ۵۱
- ۱۴۔ آگ ۵۳
- ۱۵۔ رباعی ۵۶
- ۱۶۔ بانو کے نام ۵۷
- ۱۷۔ مجسمہ ۶۰
- ۱۸۔ نشہ گیسوٹے شب تاب کہاں ۶۳
- ۱۹۔ کیا رخصت یار کی گھڑی تھی ۶۶
- ۲۰۔ میجا ۶۸
- ۲۱۔ تشنگی ۷۰
- ۲۲۔ گوارا بھی سہی جو دکھ ترے ہیں ۷۳
- ۲۳۔ کس کو گماں ہے اب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے ۷۵
- ۲۴۔ اگر کسی سے مراسم بڑھانے لگتے ہیں ۷۷
- ۲۵۔ رباعی ۷۹
- ۲۶۔ رات کے پچھلے پہر رونے کے عادی روئے ۸۰
- ۲۷۔ ان کے وعدوں پہ یقین لوگ بھی دیوانے ہیں ۸۲
- ۲۸۔ ایٹ آباد ۸۴
- ۲۹۔ تم زمانہ آشنا تم سے زمانہ آشنا ۸۷
- ۳۰۔ ہم بھی خود دشمن جاں تھے پہلے ۸۹

۹۲	۳۱۔ طلسم ہو شرابا
۹۶	۳۲۔ سکوتِ شب ہی ستم ہو تو ہم اٹھائیں بھی
۹۸	۳۳۔ وہ قول وہ سب قرار ٹوٹے
۱۰۰	۳۴۔ انکار نہ اقرار بڑی دیر سے چپ ہیں
۱۰۲	۳۵۔ خریدار
۱۰۳	۳۶۔ رباعی
۱۰۶	۳۷۔ خیر مقدم
۱۰۹	۳۸۔ اے مہجوں کی مخلوق
۱۱۲	۳۹۔ قافلے گزے ہیں زنجیر بہ پا
۱۱۴	۴۰۔ رباعی
۱۱۵	۴۱۔ قاتل کے قصے مقتل کی باتیں ہیں
۱۱۷	۴۲۔ چند نادان، چند دیوانے
۱۱۹	۴۳۔ کس قدر آگ بستی ہے یہاں
۱۲۱	۴۴۔ ہر ہم سفر ہے آبلہ پا دیکھتے رہو
۱۲۳	۴۵۔ کٹھن ہے راگنر تھوڑی دور ساتھ چلو
۱۲۵	۴۶۔ نختی
۱۲۸	۴۷۔ ایک منظر
۱۳۰	۴۸۔ رباعی
۱۳۱	۴۹۔ اس ادا سے کبھی آکر گزرو
۱۳۵	۵۰۔ دل جو کہتا ہے چلو کر دیکھو

- ۱۳۸ .۵۱ منسوبہ سے
- ۱۴۲ .۵۲ جب بھی دل کھول کے روئے ہوں گے
- ۱۴۴ .۵۳ معذرت
- ۱۴۸ .۵۴ رباعی
- ۱۴۹ .۵۵ اُداس اور زیادہ کہیں نہ ہو جائیں
- ۱۵۱ .۵۶ کچھ نہ کسی سے بولیں گے
- ۱۵۳ .۵۷ سکوت بن کے جو نغمے دلوں میں پلتے ہیں
- ۱۵۵ .۵۸ صراف
- ۱۵۹ .۵۹ منصور
- ۱۶۵ .۶۰ رباعی
- ۱۶۶ .۶۱ مشورہ
- ۱۶۹ .۶۲ غیر سے تیرا آشنا ہوتا
- ۱۷۱ .۶۳ رباعی
- ۱۷۲ .۶۴ تیرے ہوتے ہوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ
- ۱۷۴ .۶۵ آگ میں پھول
- ۱۷۷ .۶۶ رباعی
- ۱۷۹ .۶۷ میری حالت ہے کہ احساسِ طرب ہے کوئی
- ۱۸۱ .۶۸ اب جو کانٹے ہیں دل میں تمناؤں کے پھول تھے
- ۱۸۳ .۶۹ سکوت شامِ خزاں ہے قریب آجاؤ
- ۱۸۵ .۷۰ رباعی

- ۱۸۶ . ۷۱ . جانشین
- ۱۹۱ . ۷۲ . راتیں ہیں اداس دن کرٹے ہیں
- ۱۹۳ . ۷۳ . سیلاب
- ۱۹۶ . ۷۴ . لے اڑا پھر کوئی خیال ہمیں
- ۱۹۸ . ۷۵ . ہم ہیں ظلمت میں کہ اُبھرا نہیں خورشید اب کے
- ۲۰۰ . ۷۶ . ۲۳ مارچ
- ۲۰۴ . ۷۷ . دل کو اب یوں ترمی ہر ایک ادا لگتی ہے
- ۲۰۶ . ۷۸ . ہم اپنے آپ میں گم تھے ہمیں خبر کیا تھی
- ۲۰۸ . ۷۹ . تفادت
- ۲۱۰ . ۸۰ . اب تک تیرے فتنے ہیں سلامت اُسے کہنا
- ۲۱۲ . ۸۱ . تسلسل
- ۲۱۵ . ۸۲ . چاندنی رات کو سحر کہنا
- ۲۱۷ . ۸۳ . ہلالِ عید
- ۲۲۱ . ۸۴ . جانے کس غم سے من سلگتا ہے
- ۲۲۳ . ۸۵ . واہمہ
- ۲۲۶ . ۸۶ . یہ میں، یہ کوئے دارِ یہ تنہائی دوستو!
- ۲۲۸ . ۸۷ . کینیز
- ۲۳۰ . ۸۸ . آتشِ عجم

به زیرِ شاخِ گلُ افغنی گزیده بلبیل را  
نواگران نه خورده گزند را چه خبر  
( نظیری )

جب رُوح کسی بوجھ سے تھک جاتی ہے  
احساس کی نو اور مہرک جاتی ہے  
میں بڑھتا ہوں زندگی کی جانب لیکن  
زنجیر سی پاؤں میں چھنک جاتی ہے

## شاعر

جس آگ سے جی آج جل اٹھا ہے اچانک  
پہلے بھی مے سینے میں بیدار ہوئی تھی  
جس کرب کی شدت سے مری رُوح ہے بے کل  
پہلے بھی مے ذہن کا آزار ہوئی تھی  
جس سوشل سے میں آج لہو تھوک رہا ہوں  
پہلے بھی مے حق میں یہ تلوار ہوئی تھی

وہ غم — غم دنیا جسے کہتا ہے زمانہ  
 وہ غم مجھے جس غم سے سروکار نہیں تھا  
 وہ درد کہ ہر دور کے انسان نے جھیلا  
 وہ درد مرے عشق کا معیار نہیں تھا  
 وہ زحمت کہ ہر سینے کا ناسور بنا ہے  
 وہ زحمت مجھے باعث آزار نہیں تھا

دنیا نے تڑپ کر مرے شانوں کو جھنجھوڑا  
 لیکن مرا احساس غم ذات میں گم تھا  
 آتی رہیں کانوں میں المناک پکاریں  
 لیکن مراد دل اپنے ہی حالات میں گم تھا  
 میں وقت سے بیگانہ زمانے سے بہت دور  
 جام و مے و مینا و خرابات میں گم تھا

دربار کی تفریح کا سماں تھا مرا فن  
ہاتھوں میں مے طرف گدالب پہ غزل تھی  
شاہوں کی ہوا خواہی مرادوق سخن تھا  
ایوانوں کی توصیف و ثنا اور ج عمل تھی  
اور اس کے عوض لعل و جواہر مجھے ملتے  
ورنہ مرا انعام فقط تیغ اجل تھی

چھیرے کبھی میں نے لب رخسار کے قصے  
گاہے گل و بلبل کی حکایت کو نکھارا  
گاہے کسی شہزادے کے افسانے سنائے  
گاہے کیا دنیا مے پرستیاں کا نظارا  
میں کھویا رہا جن و ملائک کے جہاں میں  
ہر لحظہ اگرچہ مجھے آدم نے پکارا

برسوں یونہی دُجعی اورنگ کی خاطر  
سو پھول کھلائے کبھی سو زخم خریدے  
میں لکھتا رہا، جو بغاوت منشوں کی  
میں پڑھتا رہا قصر نشینوں کے قصیدے  
اُبھرا ابھی اگر دل میں کوئی جذبہ سرکش  
اس خوف سے چپ تھا کہ کوئی ہونٹ نہ سی دے

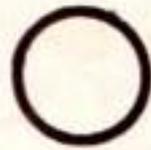
لیکن یہ طلسمات بھی تا دیر نہ رہ پائے  
آخرے و مینا و دف و چنگ بھی ٹوٹے  
یوں دست و گریباں ہوئے انسان و خداوند  
پنجیر تو تڑپے قفسِ رنگ بھی ٹوٹے  
اس کشمکشِ ذرّہ و انجسم کی فضا میں  
کشکول تو کیا افسر و اورنگ بھی ٹوٹے

میں دیکھ رہا تھا کہ مرے یاروں نے بڑھ کر  
قاتل کو پکارا کبھی مقتل میں صدا دی  
گاہے رسن دار کے آغوش میں جھولے  
گاہے عرم و دیر کی بنیاد پلا دی  
جس آگ سے بھر پور تھا ماحول کا سینہ  
وہ آگ مرے لوح و قلم کو بھی پلا دی

اور آج شکستہ ہوا ہر طوقِ طلالی  
اب فن مرا دربار کی جاگیر نہیں ہے  
اب میرا مہنر ہے مرے جمہور کی دولت  
اب میرا جنوں خائفِ تغزیر نہیں ہے  
اب دل پہ جو گزے گی وہ بے ٹوک کہوں گا  
اب میرے قلم میں کوئی زنجیر نہیں ہے

## رباعی

لفظوں کے فسانے ڈھونڈتے ہیں ہم لوگ  
لمحوں میں زمانے ڈھونڈتے ہیں ہم لوگ  
تو زہر ہی دے شراب کہہ کر ساقی  
بچنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں ہم لوگ



تیری باتیں ہی سُنانے آئے  
دوست بھی دل ہی دکھانے آئے

پھول کھلتے ہیں تو ہم سوچتے ہیں  
تیرے آنے کے زمانے آئے

ایسی کچھ چُپسی لگی ہے جیسے  
ہم تجھے حال سُنانے آئے

عشق تنہا ہے ہر منزلِ عنم  
کون یہ بوجھ اٹھانے آئے

اجنبی دوست ہمیں دیکھ کہ ہم  
کچھ تجھے یاد دلانے آئے

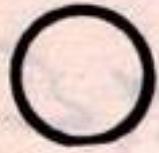
دل دھڑکتا ہے سفر کے ہنگام  
کاش پھر کوئی بلانے آئے

اب تو رُونے سے بھی دل دکھتا ہے  
شاید اب ہوش ٹھکانے آئے

کیا کہیں پھر کوئی بستی اُجڑی  
لوگ کیوں حشون منانے آئے

سو رہو موت کے پہلو میں فرار  
نہیں کس وقت نہ جانے آئے

---



جن کے دم سے تھیں بستیاں آباد  
آج وہ لوگ ہیں کہاں آباد

خل ہے ہیں ہرے بھرے گلزار  
غم ہوا ہے کہاں کہاں آباد

کہہ ہی ہے شکتی دل کی  
تھا مکینوں سے یہ مکاں آباد

ہم نے دیکھی ہے گوشہ دل میں  
ایک دُنیا ئے بے کراں آباد

چند منظر اُجڑنے والو  
ہو ہے ہیں کئی جہاں آباد

گھر بلا کر نہ رو محبت میں  
یہ تو ہوتا ہے خانہ سال آباد

کتنے تارے فراز لوٹ چکے  
بہے ابھی تک یہ خاکداں آباد

---

# کھنڈر

عبث کیوں اُلٹے پلٹے ہو جھوٹی روایات کی عظمتوں کے کھنڈر  
یہاں کچھ نہیں ہے

یہاں تم نہ پاؤ گے کوئی خزانہ  
نہ شہاد کی جنت گمشدہ کا کوئی لعل و در سے جڑا آستانہ

نہ فرعون کا کوئی خفیہ خزانہ

نہ قاروں کا کوئی دفینہ

نہ جمشید کے جام و مینا

نہ نمرود کے باغ آغوش کی چہچہاتی ہوئی کوئی الہٰی حسینہ

یہاں کچھ نہ ڈھونڈو  
یہاں کچھ نہیں ہے

یہاں خشک ویران خطوں میں

مدت سے خانہ برانداز عفریت چاروں طرف خیمہ زن ہیں

یہاں سا لہا سال سے قرن ہا قرن سے

وحشت انگیز ادھام سایہ فگن ہیں

یہاں بے شمار اُتوؤں کے بسیرے ہیں چمگادڑوں کے ٹھکانے ہیں اور

گیدڑوں نے کمی غار کھوڑے ہوئے ہیں

جو دن کے دھند لکوں میں شب کی سیاہی میں آسب صورت

کبھی ایک ایک اور کبھی سب کے سب ل کے یوں چنختے ہیں

کہ جیسے بنی نوع انساں کی تخریب پر نوحہ کر ہوں

یہاں کوئی تپتی ہوئی دوپہر ہو کہ سرما کی تاریک و مفلوج شب ہو

کبھی کوئی ابرِ خراماں نہ برسانہ چھایا  
 یہاں کوئی شعلہ نہ بھڑکانہ کوئی چراغِ سحر ٹمٹمایا  
 کہ جیسے ہمیشہ پُرافشاں رہا ہو یہاں اجنبیت کا گھمبیر سایہ  
 کہ اس سرزمین کی فضا میں خلا میں کبھی بھی کوئی بھی تغیر نہ آیا  
 مگر یہ کھنڈر

روزِ اول سے ہی

پتھروں اور اینٹوں کے انبار ہائے پریشاں نہیں تھے  
 فقط ادھکے ٹبے، شکستہ ستوں، ٹوٹے پھوٹے ظروف  
 اور بھکے بام و در، یونہی سرد گریباں نہیں تھے  
 یہاں صرف ویرانیوں کے مناظر ہی تاریخِ ماضی کے عنوان نہیں تھے  
 یہ وہ سرزمین ہے

کہ جس پر زمرّد کے یا قوت کے تختِ جلوہ فگن تھے  
 یہاں سنگِ سرخ اور مرمر کے بے مثل و نادر محلات

گلکاریوں سے مرصع تھے معراج فن تھے  
 یہاں بے مہا اور تابیاب قالین فرش رہ کاخ فرما زوائے زمن تھے  
 یہاں رشیم و اطلس و پرینیاں اور دیبا و زر بفت و سنباب و کمنجواب  
 کے بے نظیر اور عربیاں ذخیرے شکن در شکن تھے  
 یہاں لہلہاتے ہوئے گلستاں رشک باغ عدن تھے  
 یہاں سونے چاندی کے ڈھیروں میں لعل و جواہر میں  
 تلتی کنیزوں کے گل رنگ چہرے فضا تاب سینے نہرے بدن تھے  
 اور ان کی حفاظت کو چوہی صلیبیں تھیں زندان آہن تھے دار و رسن تھے

یہاں کاس و قیتار کی گرم تانوں سے جام و سبو کے فسانوں سے  
 عیش و نشاط و مسرت کے جشن چراغاں منائے گئے ہیں  
 یہاں خوش گلو اسپراؤں کے ہر تار گیسو سے تزیین بر لبط روا مہتی  
 یہاں زندگی صرف زخم نوا مہتی !!  
 یہاں با ادب با سلیقہ غلاموں نے سجدے کئے اور ثبوت و فایکلیے

گر ذہن تک کٹادیں

مگر رحمِ دل اور کشادہ دل آقاؤں کی عدل و انصاف سے  
جگمگاتی جبینوں پہ کوئی شکن تک نہ آئی

بہ ایس حال بھی مطمئن تھی خدائی

مگر وقت کی پے پے کروٹوں نے کئی گل کھلائے  
بھی تو ہلا کو و چنگیز و تیمور نے بربریت کے پرچم اٹھائے  
بھی تو رماں اور نادر کی جرار فوجوں نے یلغار کی، شہر لٹے چلائے  
تباہی کے دفِ صورِ محشر کی صورت ہر اک سمت بھونچال لائے  
بگولوں کے امن میں امن و سکون کے درخشندہ فانوس جلنے نہ پائے  
اور اپنی روایات کے تلخ و تیرہ دھوئیں چھوڑ کر بچھ گئے مٹ گئے ہیں  
یہ کہنہ روایات جن کی گھنی ظلمتوں میں نہ جادہ نہ منزل

غبارِ رواں کی طرح چھا رہی ہیں

دلوں کو دماغوں کو نظروں کو بھٹکا رہی ہیں

اور ان کے جلو میں نہ لیلانہ محل  
نہ جذبِ تحبّس کا حاصل  
یہاں کچھ نہیں کچھ نہیں ہے  
نقط کچھ کھنڈر ابن آدم کی تاریخ پر منفعل ہیں

---



کچھ ایسے ہم نے خرابے بسائے شہروں میں  
جو دشت والے تھے وہ بھی اٹھ آئے شہروں میں

ہماری سادہ دلی دیکھیے کہ ڈھونڈتے ہیں  
ہم اپنے دیس کی باتیں پرانے شہروں میں

کچھ اس طرح سے ہر اک بام و در کو دیکھتے ہیں  
زمانے بعد کوئی جیسے آئے شہروں میں

سُنا ہے جب بھی لُٹی ہے بہارِ ویرانہ  
تو چند اور چمن سُکرائے شہروں میں

قدم قدم پہ ہوئے تلخ تجربے پھر بھی  
ہمیں حیات کے غم کھینچ لائے شہروں میں

ہوا نہ دو کہ یہ جنگل کی آگ ہے یارو  
عجب نہیں ہے اگر پھیل جائے شہروں میں

فراز ہم وہ غزالانِ دشت و صحرا میں  
اسیر کر کے جنھیں لوگ لائے شہروں میں

---

# بھول

افق پر دھندلے شفق میں لاؤ گھاؤں میں شعلے چمن میں بھول

بہاروں میں صرصر کے گھمبیر سائے

نظاروں کے دامن میں نکبت بسائے

دلوں پر اُداسی دماغوں میں اُبھن خیالوں میں تلخی نگاہیں ملول

ہر اک سمیت ویرانیوں کا نزول

جلاتا رہا میں اندھیروں میں شمعیں کھلاتا رہا قارزاروں میں بھول

شعاعوں سے تاریکیوں کو اُجالے

خرا بول پہ تعسیر کا عکس ڈالے

بڑے زخم کھا کر مگر مسکرا کر کئے زندگی نے حوادث قبول  
اُڑاتی پھری دشت و صحرا کی دھول

وہی دقت کی سُستِ فتار گردشِ وہی موت کی راہزادوں کا طول  
وہی چار سو دہکے دہکے الاؤ  
وہی گلستاں میں خزاں کا رچاؤ  
وہی چاند تاروں پہ کہنہ دھندلکے وہی ظلمتوں کا پُرانا اصول  
مگر کون سمجھے یہ کس کی مہتی مہجول؟

## رباعی

اک راہِ طویل اک کڑی ہے یارو  
افتاد عجیب آپڑی ہے یارو  
کس سمت چلیں کدھر نہ جائیں آخر  
دور ہے پہ زندگی کھڑی ہے یارو

---

غنچے کی چٹک سُنائی دے گی یارو  
ساغر کی کھنک سُنائی دے گی یارو  
زندیاں کا سکوت گونج اٹھے جس سے  
ایسی دستک سُنائی دے گی یارو

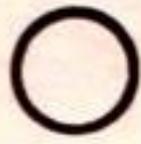
## فرار

کئی ایانغ دل میں آنسوؤں کے بیج بو گئے  
شرابِ لالہ گوں کے عکس عکس ہیں  
جہانِ رنگِ بوئے  
فریبِ آرزو دیئے  
گھنیری آنڈھیوں کے رقصِ رقص میں  
کئی چراغِ ظلمتوں کی وادیوں میں کھو گئے

نپچھے ہے سراب گام گام پر  
جمالِ صنوفِ شاں لئے  
مآلِ خو نچکاں لئے  
حیات کے ہر اک نئے مہتمام پر  
ہزاروں داغ مسکرا دیئے چراغ ہو گئے

مگر چلے ہو کس کی جستجو میں تم  
وفا کی روشنی لئے  
ہر ایک چاکِ دل سیئے  
تصویرِ حصولِ آرزو میں تم  
کئی دماغِ موت کی کمیں کہوں میں سو گئے

---



دوست جب مٹھہرے چمن کے دشمن جان بہار  
زخم دکھلائیں کسے پھر سینہ چاکان بہار

نشہ احساسِ خوش وقتی نے اندھا کر دیا  
برق بھی چمکی تو ہم سمجھے پرغان بہار

خون رلاتے ہیں سب کو اپنے اپنے تجربے  
دہ پشیمان خزاں ہوں یا پشیمان بہار

اب کے کچھ ایسی ہی بن آئی کہ ہم معذوریں  
ورنہ کب پھیرا تھا ہم نے کوئی فنِ یارِ بہار

اے خوشا عہدِ خزاں جب غمِ پیرائی تو تھی  
اب تو سرمہ درگلو ہیں خوشنوا یاں بہار

گر یونہی بادِ صبا اٹھکیلیاں کرتی پھری  
شعلہ گل سے بھڑک اٹھے گا داماں بہار

کب ہوئے دل تنگ ہم زنداں میں بھی رہ کر فرآز  
ہاں مگر جب آگئی ہے یادِ یارِ بہار

## احتساب

سوش مفلوج ہے حالات کے زندانوں میں  
عقل پر تلخ حوادث کے گراں تالے ہیں

آگہی سرد و خموش

منجمد شعلہ ہوش

ذہن پر بھولے فسانوں کے گھنے جالے ہیں  
کوئی آہٹ بھی نہیں دل کے سیہ خانوں میں  
تہقہے وقت کے خوش رنگ شبستانوں میں  
کتتی دل دزد و غمیں آہوں کے رکھوالے ہیں

آرزو حِمْ طرب

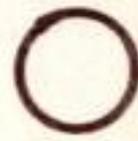
آبرو زہر بلب

کتنے ہی ناگ خستہ انوں نے یہاں پالے ہیں  
کتنے پیکر ہیں جو ڈھل جاتے ہیں ایوانوں میں  
زندگی رنگیتی ہے موت کے دیر انوں میں  
انقلابات نے انداز بدل ڈالے ہیں

رات دن شام و سحر

کس کو جرات ہو مگر

ناگ خود ہی تو خزانوں نے یہاں پالے ہیں  
آگ پھولوں نے بھیری ہے گلستانوں میں



ہر ایک دل کو طلب ہر نظر سوا لی ہے  
کہ شہرِ حسن میں جلووں کی محط سالی ہے

کہاں ہے دوست کہ آشوبِ ہر سے میں نے  
ترے خیال کی آسودگی بچالی ہے

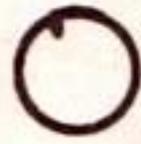
بتا رہا ہے فضا کا اٹوٹ ستاٹا  
افق سے پھر کوئی آندھی اترنے والی ہے

لڑے ہیں شگونی چمن میں کھلتے ہوئے  
حنائے دستِ صبا میں لہو کی لالی ہے

پیو شراب کہ ناصح نے زہر بھی دے کر  
ہماری جراتِ رندانہ آزمائی ہے

پھر آج دانہ گندم کے سلسلے میں فراز  
کسی خدا نے میری خلد بیچ ڈالی ہے

---



ہر شاخ چمن کی جل رہی ہے  
کیا بادِ مسرد چل رہی ہے

ہم ہیں کہ فریب کھا ہے ہیں  
دُنیا ہے کہ چال چل رہی ہے

یوں دل میں ہے تیری یاد جیسے  
دیرانے میں آگ جل رہی ہے

رُخ پھیر لیا ہے جب سے تو نے  
دُنیا کی نظر بدل رہی ہے

دُرِپیش ہے آج بھی وہ صورت  
جو صورتِ حال کل رہی ہے

اتنی بھی سراز بدِ دلی کیا  
سنجھو ! کہ فضا بدل رہی ہے

---

# آگ

مفسو ! اپنے مقدر سے شکایت نہ کرو  
اس سے انسان کے ایمان میں فرق آتا ہے  
ہم تو ناچیز سے بندے ہیں ہمیں کیا معلوم  
کونسی بات میں کیا مصلحت یزداں ہے  
کتنے گمراہ و گنہگار ہوئے جاتے ہو

کیا کہا؟ "خانماں برباد ہوئے جاتے ہیں  
دبدم آگ کے بے رحم پکتے شعلے  
اپنے بوسیدہ مکاں راکھ کئے دیتے ہیں  
خاک ہی خاک ہوئی جاتی ہے دنیا اپنی  
اور اس آتش و ظلمات کے سیلاب میں بھی  
مر مر و آہن و سیماں کی عمارات بلند  
اسی پندار اسی شان سے استادہ ہیں  
کیا خدا صرف غریبوں پرستم ڈھاتا ہے"

ٹھیک کہتے ہو مگر خام عمتاؤ والو  
ہم تو تقدیر کے بندے ہیں ہمیں کیا معلوم  
کونسی بات میں کیا مصلحتِ یزداں ہے  
اور پھر اپنی شکایت سے بھی کیا ہوتا ہے  
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

---

## رباعی

پھولوں کی جبیں جھلس گئی ہے یارو  
گلزار میں آگ بس گئی ہے یارو  
گزرے ہیں کہاں سے رنگ بو کے طوفاں  
شبِ نیم کو فضا ترس گئی ہے یارو

اُڑتے پنچھی شکار کرنے والو  
گلزار میں گیسرو دار کرنے والو  
کتی کلیاں مسل کے رکھ دیں تم نے  
تزیین گل و بہار کرنے والو

## بالوں کے نام

ملوکیت کے محل کی گناہگار کنیز  
وہ جرم کیا تھا کہ تجھ کو سزائے مرگ ملی  
وہ راز کیا تھا کہ تعزیرِ ناروا کے خلاف  
تیری نگاہ نہ بھڑکی تری زباں نہ ہلی  
وہ کونسا تھا گناہِ عظیم جس کے سبب  
ہر ایک جبر کو تو سہہ گئی بطیبِ دلی

---

۱ : وہ کمن کنیز جسے بیگم جو ناگرٹھ نے قتل کروایا

یہی سنا ہے بس اتنا قصو تھا تیرا  
کہ تو نے قصر کے کچھ تلخ بھید جانے تھے  
تیری نظر نے وہ خلوت کدوں کے داغ گنے  
ہو خواجگی کو زروسیم میں چھپانے تھے  
بتھے یہ علم نہیں تھا کہ اس خطا کی سزا  
ہزار طوق و سلاسل تھے تازیانے تھے

یہ رسم تازہ نہیں ہے اگر تری لغزش  
مزاجِ قصر نشیناں کو ناگوار ہوئی  
ہمیشہ اپنے محلّات کے بھرم کے لئے  
ہر ایک دور میں تریں طوق و دار ہوئی  
کبھی چینی گئی دیوار میں انار کلی  
کبھی شکند پتھراؤ کا شکار ہوئی

مگر یہ تخت یہ سلطاں یہ بیگمات یہ قصر  
مورخین کی نظروں میں بیگناہ ہے  
بغیض وقت اگر کوئی راز کھل بھی گیا  
زمانے والے طرفدار کج کلاہ ہے  
ستم کی آگ میں جلتے ہے عوام مگر  
جہاں پناہ ہمیشہ جہاں پناہ ہے

---

## مجسمہ

اے سیہ فام حسینہ ترا عریاں پیکر  
کتتی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں غلطیدہ ہے  
جانے کس دور المناک سے لے کر اب تک  
تو کڑے وقت کے زندانوں میں خوابیدہ ہے

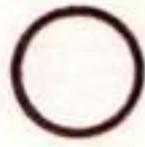
تیرے شبِ ننگِ ہموئے کے یہ بے جان نقوش  
جیسے مر لُوط خیالات کے تانے بانے  
یہ تری سانولی رنگت یہ پریشان خطوط  
بارہا جیسے مٹایا ہوا نہیں دُنیا نے

ریشہ ننگ سے کھینچی ہوئی زلفیں جیسے  
راستے سینہ کہسار پہ بل کھاتے ہیں  
ابردوں کی جھکی مہرابوں میں جامد پلکیں  
جس طرح تیر کمانوں میں اُلجھ جاتے ہیں

منجمد ہونٹوں پہ ستاٹوں کا سنگین طلسم  
جیسے نایاب خزانوں پہ کڑے پہرے ہوں  
تند جذبات سے بھر پور برہنہ سینہ  
جیسے ستانے کو طوفان ذرا ٹھہرے ہوں

جیسے یونان کے مغرور خداوندوں نے  
ریگنہ اران جلیش کی کسی شہزادی کو  
تشنہ رُحوں کے ہوسناک تعیش کے لئے  
جملہ سنگ میں پابند بنا رکھا ہو

---



نشہ کیسوںے شب تاب کہاں  
انکھ کھل جائے تو پھر خواب کہاں

جی جلاتے ہیں سحر کے جھونکے  
کھو گیا چشمہ مہتاب کہاں

شہر سنان ہے صحرا کی طرح  
اب وہ ہنگامہ احباب کہاں

سطحِ دریا تو ہے ہموار مگر  
بستیاں ہو گئیں غرقاب کہاں

تلخیِ سم ہے لبوں کے مسِ تنک  
کوئی پنی جائے تو زہر اب کہاں

عشق اک کوہِ گراں تھا پہلے  
اب محبت کے وہ آداب کہاں

اب کہاں اہلِ وفا ملتے ہیں  
پہلے ہم لوگ تھے نایاب کہاں

اب تو دھڑکن سے بھی جی رکتا ہے  
اب یہ دل پارہ سیماب کہاں

## ق

ہم بھی کرتے تھے چراغان بہار  
لیکن اب آنکھوں میں خونِ تاب کہاں

ہم کو بھی لذتِ غم تھی پیاری  
لیکن اب جی میں تب تاب کہاں

اب بھی پایاب نہیں موجِ عنم  
پھر بھی اندیشہ سیلاب کہاں

---



کیا رخصتِ یار کی گھڑی مہتی  
ہنستی ہوئی رات رو پڑی مہتی

ہم خود ہی ہوئے تباہ ورنہ  
دنیا کو ہماری کیا پڑی مہتی

یہ زحمت ہیں اُن دنوں کی یادیں  
جب آپ سے دوستی بڑی مہتی

جاتے تو کدھر کو تیرے وحشی  
زنجیر جنوں کڑی پڑی تھی

دریوزہ گر حیات بن کر  
دُنیا تری راہ میں کھڑی تھی

غم تھے کہ فرآز آندھیاں تھیں  
دل تھا کہ فرآز پنکھڑی تھی

---

# مسیحا

میری افسردگی سے پریشاں نہ ہو  
تو مری تلخیوں کا سبب تو نہیں  
تیری آنکھیں تو میری ہی دساز ہیں  
تھیں کبھی اجنبی لیکن اب تو نہیں  
تجھ کو میری مسرت مقدم ہے  
تیرا غم مجھ کو وجہ طرب تو نہیں

تیرا احسان ہے تو نے میرے لئے  
اپنی پلکوں سے راہوں کے کانٹے چُھنے

تو دُکڑی دُھوپ میں رہ کے میرے لئے  
تو نے زلفوں کے شاداب سائے بُنے  
میری خاطر زملنے کو پاگل کہا  
میری خاطر زمانے کے طعنے سُنے

تو میری زندگی ہے مگر جانِ من!  
اب وہ عشق و محبت کی رسمیں نہیں  
میرے دل میں کئی گھاؤ ایسے بھی ہیں  
جن کا درماں تری دسترس میں نہیں  
ایک غم جس کی شدت ہمہ گیر ہے  
تیرے بس میں نہیں میرے بس میں نہیں

# تشنگی

دیکھو پگھلا پگھلا سونا بہہ نکلا کہاروں سے  
دیکھو نازک نازک کرنیں ٹوٹ رہی ہیں ٹیلوں پر  
دیکھو بھینی بھینی خوشبو آتی ہے گلزاروں سے  
دیکھو نیلے نیلے بادل جھول رہے ہیں جھیلوں پر

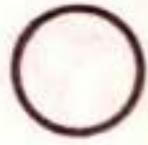
تم بھی سندر سندر سپنوں کی لہروں پر بہہ جاؤ  
اور ذرا کچھ لمحے ٹھہرو — اور ذرا رہ جاؤ

سگسا سگسا موسم ہے شعلوں کی دہکتی حد سے  
چڑھتے سوج کے سائے میں ساری دنیا جلتی ہے  
دہک دہک اٹھی ہیں بڑکیں تپتی ٹھوپ کی شدت سے  
ابھی نہ جاؤ دیکھو کتنی تیزی سے لو چلتی ہے

اس کو بھی اک جبرِ مشیت سمجھو اور سہہ جاؤ  
اور ذرا کچھ لمحے ٹھہرو — اور ذرا رہ جاؤ

دیکھو چار طرف مٹھنڈے مٹھنڈے سائے لہراتے ہیں  
تائے نکھرے موتی بکھرے شام کا جادو قائم ہے  
خنک خنک بھولوں کے جھونکے خوشبو میں برساتے ہیں  
ٹھیک ہے تم کو جانا ہے پر ایسا بھی کیا لازم ہے

مٹھرو کچھ باتیں تم سے سن لو کچھ تم کہہ جاؤ  
اور ذرا کچھ لمحے مٹھرو — اور ذرا رہ جاؤ



گوارا بھی سہی جو دکھ ترے ہیں  
مگر ہم کو کئی غم دوسرے ہیں

عجب اہل چمن کے دن پھرے ہیں  
بہاروں کے بگولوں میں گھرے ہیں

وطن میں وضع داری نے نہ چھوڑا  
پرائے شہر ہم در در پھرے ہیں

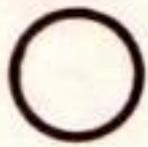
سمائے پھر نہ دُنیا کی نظر میں  
نہ جانے کس بلندی سے گھرے ہیں

غنیمت ہے جو منہس کربات کر لیں  
ہمیں مت چھیڑیئے ہم سر پرے ہیں

جو دُنیا کے ہوئے وہ سحت روئے  
خوشادہ لوگ جو اب تک ترے ہیں

ابھی سے کیا حدیثِ قعرِ دریا  
ابھی تو موجِ ساحل میں گھرے ہیں

فرازِ آج اتفاقاً مل گئے تھے  
یہ صاحب بھی تو دیوانے نرے ہیں



کس کو گماں ہے اب کہ مے ساتھ تم بھی تھے  
ہائے وہ روز و شب کہ مے ساتھ تم بھی تھے

یادش بخیر عہدِ گزشتہ کی صحبتیں  
اک دور تھا عجب کہ مے ساتھ تم بھی تھے

بے مہری حیات کی شدت کے باوجود  
دل مطمئن تھا جب کہ مے ساتھ تم بھی تھے

میں اور تقابلِ عظیم دوراں کا حوصلہ  
کچھ بن گیا سبب کہ مے ساتھ تم بھی تھے

اک خواب ہو گئی ہے رہ و رسم دوستی  
اک دہم سا ہے اب کہ مے ساتھ تم بھی تھے

وہ بزمِ دوست یاد تو ہو گی تمہیں سراز  
وہ محفلِ طرب کہ مے ساتھ تم بھی تھے

---



اگر کسی سے مراسم بڑھانے لگتے ہیں  
تو فراق کے دکھ یاد آنے لگتے ہیں

ہمیں ستم کا گلہ کیا، کہ یہ جہاں والے  
کبھی کبھی ترا دل بھی دکھانے لگتے ہیں

سینے چھوڑ کے ساحل چلے تو ہیں لیکن  
یہ دیکھنا ہے کہ اب کس ٹھکانے لگتے ہیں

پلک بھپکتے ہی دُنیا اُجاڑ دیتی ہے  
وہ بستیاں جنہیں بے سے زمانے لگتے ہیں

فراز ملتے ہیں غم بھی نصیب و لون کو  
ہر اک کے ہاتھ کہاں یہ خزانے لگتے ہیں

---

## رباعی

یہ دورے و جام چلے یا نہ چلے  
نشے سے بھی پھر کام چلے یا نہ چلے  
ہم اہلِ خرابات سے یوں بیر نہ رکھ  
ساقی ترا کل نام چلے یا نہ چلے

یہ پھیلی ہوئی رات ڈھلے یا نہ ڈھلے  
یہ یورشِ حالات ٹلے یا نہ ٹلے  
روشن کر چراغِ دیر و کعبہ  
پھر شمعِ خرابات چلے یا نہ چلے



رات کے پچھلے پہر رونے کے عادی روئے  
آپ آئے بھی مگر رونے کے عادی روئے

ان کے آنے سے کچھ تھم سے گئے تھے آنسو  
ان کے جاتے ہی مگر رونے کے عادی روئے

ہائے پابندی آداب تری محفل کی  
کہ سر راہگزر رونے کے عادی روئے

ایک تقریبِ تبسم تھی بہاراں لیکن  
پھر بھی آنکھیں ہوئیں تر رونے کے عادی روئے

درد مندوں کو کہیں بھی تو قرار آنہ سکا  
کوئی صحرا ہو کہ گھر رونے کے عادی روئے

اے فراز ایسے میں برسات کے ٹپگی کیونکر  
گر یونہی شام و سحر رونے کے عادی روئے

---



ان کے وعدوں پر یقین، لوگ بھی دیوانے ہیں  
اک نقطہ میں ہی نہیں، لوگ بھی دیوانے ہیں

میری وحشت ہی سہی مورد الزام مگر  
اے مری زہرہ جیسے، لوگ بھی دیوانے ہیں

گردشیں جام کہاں، گردشیں ایام کہاں  
یہ خرابات نشیں، لوگ بھی دیوانے ہیں

آپ تو حاصلِ ایمانِ دو عالم ہیں حضور  
آپ اور دشمنِ دیں، لوگ بھی دیوانے ہیں

اک ملاقاتِ سرِ رہ بھی سہی جرمِ مگر  
ہم کہیں آپ کہیں، لوگ بھی دیوانے ہیں

دردِ مندانِ محبت تو ہیں بدنامِ فراز  
ورنہ کچھ کچھ یہ حسین، لوگ بھی دیوانے ہیں

---

## ایبٹ آباد

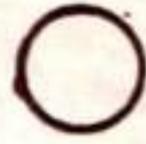
ابھی تک ہے نظر میں وہ شہر سبزہ و گل  
جہاں گھٹائیں سر راگزار جھومتی ہیں  
جہاں ستارے اترتے ہیں جگنوؤں کی طرح  
جہاں پہاڑوں کی توہیں فلک کو چومتی ہیں  
تمام رات جہاں چاندنی کی خوشبو میں  
چنار و سرو کی پر چھائیوں میں گھومتی ہیں

ابھی تلک ہیں نظر کے نگار خانے میں  
وہ برگِ گل سے تراشے ہوئے بہشت سے جسم  
وہ بولتے ہوئے افسانے الف بیلے کے  
وہ رنگ و نور کے پیکر وہ زندگی کے طلسم  
اور ایسی کتنی ہی رعنائیاں ہیں جن کے لئے  
خیال و فکر کی دنیا میں کوئی نام نہ اسم

ابھی تلک ہیں تصور میں وہ در و دیوار  
بسیط دامن کہسار میں چناروں تلے  
جہاں کسی کی جواں زلف بارہا بکھری  
جہاں دھڑکتے ہوئے دل محبتوں میں ڈھلے  
عجیب تھی وہ بھردکوں کی نیم تاریکی  
جہاں نظر سے نظر جب ملی چراغِ جلے

میں لوٹ آیا ہوں اس شہرِ سبز و گل سے  
مگر حیات انہیں ساعتوں پہ مرتی ہے  
مجھے یقین ہے گھنے بادلوں کے سائے میں  
وہ زلف اب بھی مری یاد میں بھرتی ہے  
پیراغ بجھ بھی چکے ہیں مگر پس حلیمین  
وہ آنکھ اب بھی مرا انتظار کرتی ہے

---



تم زمانہ آشنا تم سے زمانہ آشنا  
اور ہم اپنے لئے بھی اجنبی نا آشنا

راستے بھر کی رفاقت بھی بہت ہے، جان من  
ورنہ منزل پر پہنچ کر کون کس کا آشنا

اب کے ایسی آندھیاں اٹھیں کہ سوج بجھ گئے  
ہائے وہ شمعیں کہ جھونکوں سے بھی تھیں نا آشنا

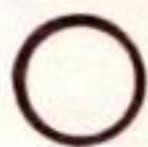
مدتیں گزریں اسی بستی میں لیکن اب تک  
لوگ ناواقف، فضا بیگانہ، ہم نا آشنا

ہم پھرے شہروں میں بھی تنہا ہیں جانے کس طرح  
لوگ ویرانوں میں کر لیتے ہیں پیدا آشنا

خلق شبغم کے لئے دامن کشا صحراؤں میں  
کیا خبر ابر کرم ہے صرف دریا آشنا

اپنی بربادی پہ کتنے خوش تھے ہم لیکن فراز  
دوست دشمن کا بکل آیا ہے اپنا آشنا

---



ہم بھی خود دشمن جاں تھے پہلے  
تم مگر دوست کہاں تھے پہلے

اب وہاں خاک اڑاتی ہے خزاں  
پھول ہی پھول جہاں تھے پہلے

اب جو دیوار بنے بیٹھے ہیں  
صورت موج رواں تھے پہلے

کچھ شرابی کہ ہیں اب راہ نشیں  
رونی بزمِ مغان تھے پہلے

ہم کہ ہیں آج غبارِ پس رو  
منزل ہم سفران تھے پہلے

اب کسے وضعِ محبت کا خیال  
اور ہی لوگ یہاں تھے پہلے

اب تو خود پر بھی نہیں زعم و فا  
تجھ سے ہم شکوہ کناں تھے پہلے

بن گیا قافلہ چلتے چلتے  
ورنہ تنہا ہی رواں تھے پہلے

دولتِ غم تو میسر تھی سراز  
اتنے مفلس بھی کہاں تھے پہلے

---

## طلسم ہوشربا

ابھی اک پھول کے دامن سے کوئی مہنورا اڑا  
اور اڑتے ہی اُجالے میں کہیں ڈوب گیا  
ابھی اک شاخ کے ساٹے سے سرکتا ہوا سانپ  
پاس بہتے ہوئے نالے میں کہیں ڈوب گیا

گنگناتے ہوئے نالے کا سنہرا پانی  
دیکھتے دیکھتے اک جھیل بنا نہر بسا  
یوں اُجھرائے کناروں پہ دکھتے ایواں  
ایک اُجڑے ہوئے خطے میں نیا شہر بسا

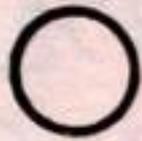
یہ فضیلوں میں گھرا راج محل کس کا ہے  
یہ پر اسرار در و بام انوکھے فانوس  
ربط و چنگ و خم و جام لئے دست بدست  
منتظر کس کا ہے یہ زہرہ جبینوں کا جلو کس

میں شہنشاہِ زمین ہوں کسے معلوم نہیں  
ہر طرف موجبِ تعمیل ہیں فرمانِ مے  
میرے ادنیٰ سے اٹائے یہ ہیں سبِ قصہ کنناں  
یہ سپاہی 'یہ حسینائیں' یہ دربانِ مے

کوئی ہے! کون؟ زریںہ نظر افروز کینز  
جیسے مینائے مے ناب دھری ہو کوئی  
یہ پریشان سی زلفیں یہ برہنہ سینہ  
جس طرح تاف کی آوارہ پری ہو کوئی

خادمہ! آج سے اس قصر کی تو ملکہ ہے  
آبِ مجھے اپنی گرہ گیر لٹوں میں کس لے  
امرے جسم سے اک سانپ کی مانند لپیٹ  
اور تڑپ کر مرے بیاب لبوں کو ڈس لے

---



سکوتِ شب ہی ستم ہو تو ہم اٹھائیں بھی  
وہ یاد آئے تو چلنے لگیں ہوائیں بھی

یہ شہر میرے لئے اجنبی نہ تھا لیکن  
تمہارے ساتھ بدلتی گئیں فضاؤں بھی

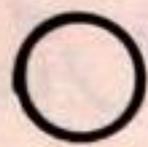
جو بزمِ دوست سے اُٹھ کر چلے بزمِ تمام  
کوئی پکارے تو شاید وہ لوٹ آئیں بھی

دلوں کا قرب کہیں فاصلوں سے ملتا ہے  
یہ خود فریب ترا شہر چھوڑ جائیں بھی

ہم ایسے لوگ جو آشوبِ دہر میں بھی ہیں خوش  
عجب نہیں ہے اگر تجھ کو بھول جائیں بھی

سحر گزیدہ ستاروں کا نورُ بھنے لگا  
فرآز اُٹھو اب اس کی گلی سے جائیں بھی

---



وہ قول وہ سب قرار ٹوٹے  
دل جن سے مائل کار ٹوٹے

ہو ختم کشاکشِ زمانہ  
یا دامِ خیالِ یار ٹوٹے

پھر تجھ پہ یقین کر رہے ہیں  
وہ دل جو ہزار بار ٹوٹے

کھائیں گے فریب ہم خوشی سے  
پر، یوں کہ نہ اعتبار ٹوٹے

وہ پچھلا پہر شبِ الم کا  
آنسو بھی ستارہ وار ٹوٹے

کیا چھوڑتے یاد دوستوں کی  
وہ تیر، جو دل کے پار ٹوٹے

کانپ اُٹھے فراز دونوں عالم  
جب سازِ وفا کے تار ٹوٹے

---



انکار نہ اترار بڑی دیر سے چُپ ہیں  
کیا بات ہے سرکار بڑی دیر سے چُپ ہیں

آسان نہ کر دی ہو کہیں موت نے مشکل  
رُتے ہوئے بیمار بڑی دیر سے چُپ ہیں

اب کوئی اشارہ ہے نہ پیغام نہ آہٹ  
بام و در و دیوار بڑی دیر سے چُپ ہیں

ساتی یہ خموشی بھی تو کچھ غور طلب ہے  
ساتی ترے میخوار بڑی دیر سے چپ ہیں

یہ برق نشیمن پہ گری تھی کہ قفس پر  
مرغان گرفتار بڑی دیر سے چپ ہیں

اس شہر میں ہر جنس بنی یوسف کنگاں  
بازار کے بازار بڑی دیر سے چپ ہیں

پھر نعرہ مستانہ فراز آؤ لگائیں  
اہل رسن و دار بڑی دیر سے چپ ہیں

---

## خریدار

دل بیتاب کی موہوم سی تسکیں کے لئے  
اک نظر دیکھنے آیا تھا تجھے دیکھ لیا  
آج کی رات بھی تو اپنے دیچے کے قریب  
حسب معمول نئی شان سے استاد ہے  
تیرے ہیں تری آنکھوں میں اشائے کیا کیا  
دیدنی ہے ترے جلووں کی نمائش لیکن  
اب یہ عالم ہے کہ احساس تہی دستی سے  
تیرے زینے کی طرف تیرے دیچے کی طرف  
پاؤں تو کیا مری نظریں بھی نہیں اٹھ سکتیں

## رباعی

خوابوں میں خیال کھو رہے ہوں جیسے  
نشے میں زمانے سو رہے ہوں جیسے  
سینے سے ڈھلک گیا ہے کس کا آنچل  
خورشید طلوع ہو رہے ہوں جیسے

ساغر میں ستارے گھل رہے ہوں جیسے  
کرنوں کے دیچے کھل رہے ہوں جیسے  
مستی میں اٹھتی ہوئی نظریں توبہ  
پلکوں پہ زمانے تل رہے ہوں جیسے

## خیر مقدم

قصیدہ نویسوں نے مل کر یہ سوچا  
کہ پھر آج وہ ساعتِ جانتاں آگئی ہے  
جب ان سے کوئی ان کا آقا جدا ہو رہا ہے  
وہ آقا؟

کہ جس کی مسلسل گرم گستری سے  
کوئی خادم خاص ہو یا کہ ادنیٰ ملازم  
کسی کے لبوں پر کبھی کوئی حرفِ شکایت نہ آیا  
وہ آقا کہ جس کی کشادہ دلی نے خزانے لٹائے

وہ آقا کہ جس کی سخاوت نے سب کے دلوں اور دماغوں

سے حاتم کے مفروضہ قصے بھلائے

اگرچہ وہ نوشیرواں کی طرح شہر میں کو بکو

بھیس بدلے نہیں گھومتا تھا

مگر پھر بھی ہر سمت امن و اماں تھا

اگرچہ جہانگیر کی طرح اس نے

کوئی ایسی زنجیر زر قصر شاہی کے باہر نہ لٹکانی تھی

جس کی ہلکی سی جنبش بھی انصاف شاہی میں طوفاں اٹھاتی

مگر پھر بھی ہر گھر پہ عدل و مساوات کا سائباں تھا

اگرچہ کبھی وہ بھروسے کے میں بیٹھے

رعایا کو رونے مبارک کے درشن سے مجبور سجدہ نہ کرتا

مگر پھر بھی ہر دل پہ وہ حکمراں تھا

وہ جان جہاں تھا

بڑا مہرباں تھا

قصیدہ نولسیوں نے سوچا  
کہ آخر وہ لمحات بھی آگئے ہیں  
جب ان سے بچھڑنے کو ہے ان کا دیرینہ آقا  
تو وہ آج اسے کونسا ایسا نایاب تحفہ کریں پیش جس سے  
رہیں تا ابد یاد آقائے عالی کو

اپنے وفادار و پاپوش بردار خادم

قصیدہ نولسیوں نے سوچا  
کہ وہ یوں تو عہدے میں ہیں  
نصر شاہی کے جاروب کش سے بھی کہتر  
مگر عالم کلک و قرطاس کے بادشہ ہیں  
وہ چاہیں تو اپنے قلم کے اشائے سے  
ذروں کو ہم رتبہ مہر و مہتاب کر دیں  
وہ چاہیں تو اپنے تخیل کے جادو سے  
صحراؤں کے خشک سینوں کو پھولوں سے بھر دیں

فقیروں کو اورنگِ افسر کا مالک بنا دیں

وہ چاہیں تو اپنے فسوںِ زباں سے

محلّات کے بام و دیوار ڈھا دیں

وہ چاہیں تو خسرو کا سر تیشہ کو کہن سے کچل دیں

وہ چاہیں تو یکسر نظامِ زمانہ بدل دیں

کہ وہ عالمِ کلکِ قرطاس کے بادشہ ہیں

یہی ہے وہ ساعت کہ وہ اپنے

محبوب آقا کی تعریف و توصیف میں

آسمان و زمیں کو ملائیں!

کہ وہ اپنی اپنی طبیعت کے جوہر دکھائیں

کہ وہ اپنے آقا سے بس آخری مرتبہ داد پائیں

مگر پھر قصیدہ نویسوں نے سوچا

کہ وہ تو ہیں عہدے میں ایوانِ شاہی

کے جا رو بکش سے بھی ہنتر

انہیں کیا کوئی آٹے یا کوئی جائے

کہ ان کا فریضہ تو ہے صرف

آفاتے حاضر کی خدمت گزارا

کہ ان کا فریضہ فقط تاج اور تخت کی ہے پرستش

تو پھر مصلحت ہے اسی میں

کہ اپنے قصیدوں سے آفاتے نو کا کریں خیر مقدم!

# اے بھوکے مخلوق

(پچودہ اگست ۱۹۵۲ء)

آج تری آزادی کی ہے ساتویں سالگرہ  
چار طرف جگمگ جگمگ کرتی ہے شہر پہنہ  
پھر بھی تیری رُوح بھی ہے اور تقدیر سیہ

پھر بھی ہیں پاؤں میں زنجیریں ہاتھوں میں کشتکول  
کل بھی تجھ کو حکم تھا آزادی کے بول نہ بول  
آج بھی تیرے سینے پر ہے غیروں کی بندوق  
اے بھوکے مخلوق

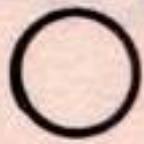
بیس نہ سو، نہ ہزار، نہ لاکھ ہیں، پورے آٹھ کروڑ  
اتنے انسانوں پر لیکن چند افراد کا زور  
مزدور اور کسان کے حق پر جھپٹیں کالے چور

کھیت تو سونا اگلیں پھر بھی ہے تاپیدانا ج  
تیرے دیس میں سب کچھ اور تو غیروں کی محتاج  
گوداموں کے پیٹ بھرے ہیں بوجھل ہیں صندوق  
اے بھوکے مخلوق

اسج گرفتہ دل تو کیوں ہے تو بھی جسن منا  
انسو کر نایاب ہیں اپنے لہو کے دیے جلا  
پیٹ پہ پتھر باندھ کے امشب ننگا پاچ دکھا

آج تو منہسی خوشی کا دن ہے آج یہ کیسا سوگ  
تیری بہاریں دیکھنے آئیں دُور دُور کے لوگ  
تیرے خزانے پل پل لوٹیں کتنے ہی فاروق  
اے بھوکے مخلوق

---



قافلے گزرے ہیں زنجیر بہ پا  
دائم آباد رہے شہر ترا

دل ہے یا شہر خموشاں کوئی  
نہ کوئی نچاپ، نہ دھڑکن، نہ صدا

آخر عشق کی رسوائی ہے  
اب ہوا چرچا تو گھر گھر ہو گا

تجھ کو دیکھا ہے تو اب سوچتے ہیں  
تجھ سے ملنے کا سبب کیا ہوگا

وہم تھا تافلہ ہمسفران!  
مڑ کے دیکھا تو کوئی ساتھ نہ تھا

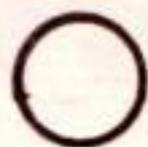
شب تیرہ ہی غنیمت تھی فراز  
چاند نکلا ہے تو دل ڈوب چلا

---

## رباعی

ہر غم کو دلاویز کئے دیتا ہوں  
احساس کی لوتیز کئے دیتا ہوں  
تو زلف کو کچھ اور پریشاں کر دے  
میں جام کو لبریز کئے دیتا ہوں

دل گرمی احساس سے پھک جائیں گے  
قدموں میں ترے زمانے جھک جائیں گے  
اے حسن فقط جنبش ابرو کی ہے دیر  
دنیا کے کار و بار رک جائیں گے



قاتل کے قصے مقتل کی باتیں ہیں  
آج کی محفل میں بھی کل کی باتیں ہیں

دیوانوں پر اک اک لمحہ بھاری ہے  
ہوش کی باتیں کتنی ہلکی باتیں ہیں

تنگ قبائے کچھلے زریں مرنے  
اس کافر میں ساری غزل کی باتیں ہیں

اپنی تہی دستی پر میں شرمندہ ہوں  
تیرے لبوں پر تاج محل کی باتیں ہیں

عقل کے اندھوں کی محفل میں چپکے فرار  
کتی سیانی اس پاگل کی باتیں ہیں

---

## چند نادان چند دیوانے

رات کی جانگداز ظلمت میں  
عزم کی مشعلیں جلائے ہوئے  
دل میں لے کر بغاوتوں کے شرار  
وحشتوں کے مہیب سائے ہیں  
سرکبف، جاں بلب، نگاہ بہ قصر  
سرخ و خونیں علم اٹھائے ہوئے  
بڑھ بے ہیں جنوں کے عالم میں  
چند نادان چند دیوانے

قصر شاہی کے اے نگہبانو!  
تلخ لمحوں سے ہوشیار رہو  
اپنے پہروں پہ جم کے ڈٹ جاؤ  
اپنے آقاؤں کی بقا کے لئے  
فرض کے تند و تیز دھارے پر  
تم وفادار ہو تو کٹ جاؤ

اس سے پہلے کہ مہرباں آقا  
تند شعلوں کی زد میں آجائیں  
اس سے پہلے کہ قصر جل اٹھے  
خاک پر لوٹتے نظر آئیں  
چند نادان، چند دیوانے



کس قدر آگ بستی ہے یہاں  
خلق شبہم کو ترستی ہے یہاں

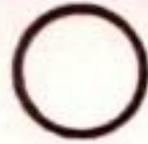
صرف اندیشہ افعی ہی نہیں  
پھول کی شاخ بھی ڈستی ہے یہاں

رُخ کدھر موڑ گیا ہے دریا  
اب نہ وہ لوگ نہ بستی ہے یہاں

زندہ درگور ہوئے اہل نظر  
کس قدر مردہ پرستی ہے یہاں

زلیبت وہ جنس گراں ہے کہ فراز  
موت کے مول بھی سستی ہے یہاں

---



ہر مہم سفر ہے آبلہ پا دیکھتے رہو  
یارو پلٹ پلٹ کے ذرا دیکھتے رہو

کس کس کو اپنی اپنی رفاقت پر زعم ہے  
ہوتا ہے کون کون جدا دیکھتے رہو

ہر فصل گل ہے غیر یقینی سی ان دنوں  
صر صر چلے کہ باد صبا دیکھتے رہو

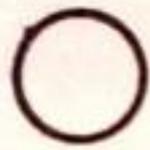
سنتے رہو کہ وقت نے بدلی ہے راگنی  
دم بھر میں انقلاب ہوا دیکھتے رہو

تھا کل تو ایک نعرہ منسو بھی گراں  
اور اب کہ سینکڑوں ہیں خدا دیکھتے رہو

یار و پلک جھپکتے ہی لٹتے ہیں قافلے  
یاں خود کشتی ہے لغزش پا دیکھتے رہو

احباب کوئے دار و رسن تک پہنچ گئے  
اور تم فراز دست صبا دیکھتے رہو

---



کٹھن ہے راگہزر تھوڑی دُور ساتھ چلو  
بہت کڑا ہے سفر تھوڑی دُور ساتھ چلو

تمام عس کہاں کوئی ساتھ دیتا ہے  
یہ جانتا ہوں مگر تھوڑی دُور ساتھ چلو

نشے میں چور ہوں میں بھی، تمہیں بھی ہوش نہیں  
بڑا مزہ ہو اگر تھوڑی دُور ساتھ چلو

یہ ایک شب کی ملاقات بھی غنیمت ہے  
کسے ہے کل کی خبر تھوڑی دُور ساتھ چلو

ابھی تو جاگ رہے ہیں چراغِ راہوں کے  
ابھی ہے دُور سحر تھوڑی دُور ساتھ چلو

طوافِ منزلِ جاناں ہمیں بھی کرنا ہے  
فرازِ تم بھی اگر تھوڑی دُور ساتھ چلو

---

## لختی

ادھ کٹے بالوں پہ انشاں کے تارے لڑاں  
کھر دے گالوں پہ غارے کی تہیں ہانپتی ہیں  
سر د بے جان سے چہرے پر تھرکتی آنکھیں  
جیسے مرگھٹ میں چراغوں کی لویں کانپتی ہیں

---

صد | سرحد کے وہ رقص لڑکے جو بیاہ شادیوں اور خوشی کی  
تقریبات کے موقعوں پر عورتوں کا روپ دھار کرنا چتے ہیں

لوٹتے جسم میں اہرانے کی ناکام امنگ  
کسی سُوکھی ہوئی ٹہنی کا جھکاؤ جیسے  
لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کی گراں رفتاری  
خشک ہوتی ہوئی ندی کا بہاؤ جیسے

رقص کرتی ہوئی پشتواز پہ بانہوں کی اڑان  
بادِ باں جس طرح گرداب میں چکراتے ہیں  
یا کسی بھیل میں کنکر کے گرا دینے سے  
چند لمحوں کے لئے دائرے بن جاتے ہیں

گرد آلود سے ماتھے پہ پسینے کی نمی  
ریگزاروں سے عرق مچوٹ رہا ہو جیسے  
بھنجناتے ہوئے ہرگام پہ پیلے گھنگرو  
دور اک شیش محل ٹوٹ رہا ہو جیسے

زندگی بال فشاں، خاک بہ رُخ، نالہ بلب  
منجمد، ساکن و حیران ہیولے کی طرح  
چند تانبے کے تراشے ہوئے سکوں کے عوض  
ڈھول کی تھاپ پہ رقصاں ہے بگولے کی طرح

---

# ایک منظر

دور کچھ مائمی نعروں سے فضا گونج اٹھی  
چند مجذوبے لوگوں کا الم کوشش کردہ  
(کچھ سیہ پوش تماشاخانے بہ اندازِ جلوس)  
چادرِ گل سے سجائے ہوئے اعلامِ لیے  
دمبدم نیند میں ڈوبے ہوئے کوچوں کی طرف  
چھیٹا پیٹا بڑھتا ہی چلا جاتا ہے

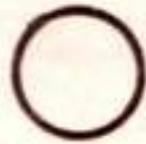
یک بیک کھلنے لگے بند دیر بچوں کے کواڑ  
چلمنیں کا پیتی بانہوں کے سہاے اٹھیں  
جیسے دم توڑتے بیمار کی بو جھل پلکیں  
اور کئی مضطربے تاب دکھتے چہرے  
ایک لچپ و المناک تماشے کے لئے  
تنگ و تاریک جھروکوں کے گھنے پردوں سے  
نور کے چشموں کی مانند اہل آئے ہیں

---

## رباعی

ظلمات کو موج نور کیسے سمجھیں  
پھر برق کو برق طور کیسے سمجھیں  
مانا کہ یہی مصلحت اندیشی ہے  
ہم لوگ مگر حضور کیسے سمجھیں

آشوب گہر دہر کے سوداگر ہیں  
مغرب کے کسی شہر کے سوداگر ہیں  
تم آبِ حیات مانگتے ہو ان سے  
جو لوگ فقط زہر کے سوداگر ہیں



اس ادا سے کبھی آ کر گزرو  
دل کے صحرا کو بسا کر گزرو

سنگِ خار ہے زمانے کی خاطر  
دل کے آئینے بچا کر گزرو

روشنی رہبر رہن بھی تو ہے  
راہیو! شمعیں بجھا کر گزرو

کون جانے کہ یہ پتھر ہیں کہ لوگ  
دشتِ غربت میں صدا کر گزرو

کوئی کانٹا ہو کہ شبنم ہو کہ پھول  
سب کو آنکھوں سے لگا کر گزرو

سفرِ شوق ہو یا منزلِ غم  
کوئی ہنگامہ اٹھا کر گزرو

چڑھتے سورج کے پجاری نہ بنو  
اپنے سائے میں سما کر گزرو

وقت نے ساتھ دیا ہے کس کا  
جی میں جو آئے سدا کر گزرو

پہلے دیوانوں کی رسمیں تھیں یہی  
خون کانٹوں کو پلا کر گزرو

ایک نیل مٹھرو بچوں کی طرح  
اور پھر خاک اڑا کر گزرو

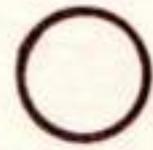
یا تو موجوں کے شناسا نہ بنو  
یا کناروں کو بہا کر گزرو

دل عجب شہر ہے ہنگاموں کا  
بھی اس سمت بھی آ کر گزرو

تو سن وقت کی رفتار کے ساتھ  
برق کے پنکھ لگا کر گزرو

فکر و ادراک کے دروں میں فرار  
مشعلِ طبع جلا کر گزرو

---



دل جو کہتا ہے چلو کر دیکھو  
کسی بے درد کے ہو کر دیکھو

لذتِ غم بھی عجب نشہ ہے  
دوست کی یاد میں رو کر دیکھو

زندگی سلسلہ خوابِ طرب  
سایہ زلف میں سو کر دیکھو

کتنی تسکین ہے احساس کی موت  
کبھی دیوانہ تو ہو کر دیکھو

کتنا دلکش ہے جہان گزراں  
دل کے آئینے کو دھو کر دیکھو

ماہ و انجم بھی تھے آباد کبھی  
ان خرابوں سے بھی ہو کر دیکھو

ریشہ گل میں بھی ہے موجہ خوں  
خار کی نوک چھو کر دیکھو

اوس کی بوند بھی ہے شیش نگر  
آنکھ اشکوں سے بھگو کر دیکھو

ذرتے ذرتے میں ہے آباد جہاں  
خود کو ہر شے میں سمو کر دیکھو

شب کے ستاڑوں میں وہ بات کہاں  
دن کے ہنگاموں میں کھو کر دیکھو

تم بگولوں کے خداوند سہی  
آتش گل تو فرو کر دیکھو

جو دیئے لے کے نکلتے ہیں فراز  
وہ بھی کھا جاتے ہیں ٹھوکر دیکھو

---

## منسوب سے

تو نے دیکھا ہی نہیں مجھ کو تجھے کیا معلوم  
وقت نے آج کسے سونپ دیا ہے تجھ کو  
کس کے دامن سے ہے باندھا گیا پلو تیرا  
کس سے تقدیر نے وابستہ کیا ہے تجھ کو

تیرے ہونٹوں پہ تو ہیں شرم و حیا کی مہریں  
تیرے ماں باپ نے کیوں نرخ ترا بول دیا  
کالے بازار میں نیلام اٹھا کر تیرا  
سبز باغوں کے تصور پہ تجھے تول دیا

جو سجائی گئی فردوس نمائش کے لئے  
وہ کسی اور کی تعمیر ہے میری تو نہیں  
یہ مکانات ' یہ جنڈر ' یہ دکانیں ' یہ زمیں  
میرے اجداد کی جاگیر ہے میری تو نہیں

میں تو آوارہ سا شاعر ہوں مری کیا وقعت  
ایک دو گیت پریشان سے گالیتا ہوں  
گا ہے گا ہے کسی ناکام شرابی کی طرح  
ایک دو زہر کے ساغر بھی چڑھا لیتا ہوں

تو کہ اک دادی گل رنگ کی شہزادی ہے  
دیکھ بے کار سے انساں کے لئے وقت نہ ہو  
تیرے خوابوں کے جزیروں میں بڑی دلت ہے  
ایک انجان سے طوفاں کے لئے وقت نہ ہو

سوش ابھی وقت ہے حالات بدل سکتے ہیں  
ورنہ اس رشتہ بے ربط پہ پھپھتائے گی  
توڑ ان کہنہ رسومات کے بندھن ورنہ  
جیتے جی موت کے زنداں میں اتر جائے گی

---



جب بھی دل کھول کے رٹے ہوں گے  
لوگ آرام سے سوئے ہوں گے

بعض اوقات بہ مجبوری دل  
ہم تو کیا آپ بھی رٹے ہوں گے

صبح تک دستِ صبا نے کیا کیا  
پھول کانٹوں میں پرٹے ہوں گے

وہ سینے جنہیں طوفاں نہ ملے  
ناخداؤں نے ڈبوئے ہوں گے

رات بھر سنستے ہوئے تاروں نے  
ان کے عارض بھی بھگوئے ہوں گے

کیا عجب ہے دم ملے بھی ہوں فراز  
ہم کسی دھیان میں کھوئے ہوں گے

---

# معذرت

(ایک دوست کی شادی پر)

میں نے چاہا تری شادی پہ کوئی نظم کہوں  
جس کے الفاظ میں پازیب کی جھنکاریں ہوں  
جس کے ہر بند میں رقصاں ہوں بہاریں نعے  
جس کے شعروں میں خیابانوں کی مہکائیں ہوں

میں نے چاہا تری شادی پہ کوئی گیت کہوں  
جس کی تشبیہوں میں ہنستے ہوئے پیمانے ہوں  
جس کے انداز پہ طاری ہو شرابوں کا نشہ  
جس کے مفہوم میں افسانے ہی افسانے ہوں

میں نے چاہا تری شادی پہ کوئی سہرا لکھوں  
جس کی ہر نے سے کئی گیت ہم آہنگ رہیں  
جس سے جاگ اٹھیں مغنی کی سُر ملی تانیں  
جس میں افکار کی ترتیب کے سب رنگ رہیں

جن کی شادی بھی غم و رنج کا مجموعہ ہے  
جن کو حاصل نہیں ہوتا کسی لمحہ بھی فراغ  
جن کو ماں باپ سے ملتے ہیں مصائب کے جہیز  
جن کی باراتوں میں جل اٹھتے ہیں اشکوں کے چراغ

لیکن اس وقت مرے ذہن کے ہر پرے میں  
چند سگی ہوئی آہوں کے سوا کچھ بھی نہیں  
میری سانسوں میں ہیں مغموم دلوں کی چھینیں  
جن کی قسمت میں کراہوں کے سوا کچھ بھی نہیں

ایسے حالات میں کیا چیز تجھے نذر کروں  
یہ حقائق مجھے مجبور کئے دیتے ہیں  
میرے شاہد مرے اخلاص سے مایوس نہ ہو  
چند صدے مجھے معذور کئے دیتے ہیں

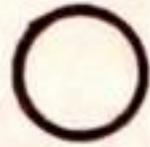
---

ۛ دوست کا نام

## رباعی

یا اپنے رفیقانِ سفر سے کٹ جاؤ  
یا سیلِ حوادث کے مقابل ڈٹ جاؤ  
رستے کا غبار کیوں بنے ہو چھٹ جاؤ  
جب بڑھ نہیں سکتے تو پرے مہٹ جاؤ

ہر زخم کو سینے پہ سجایتے ہیں  
ہر درد کو ہم دل میں بسایتے ہیں  
تم پھولوں پہ سوتے ہو تو دکھتا ہے بدن  
ہم کانٹوں کو آنکھوں سے لگایتے ہیں



اُداس اور زیادہ کہیں نہ ہو جائیں  
فسراز انجمن دوست سے چلو جائیں

نہ اجنبی نہ مسافر نہ شہر والے ہیں  
کوئی پکارو کہ ہم بھی کسی کے ہو جائیں

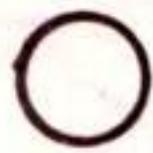
جو صدے ہم پہ گزرنے ہیں وہ تو گزریں گے  
مگر یہ آپ کو غم کیوں ہے آپ تو جائیں

اُبھتے ہیں ترے سودائیوں سے اہلِ خرد  
یہ سادہ لوح بھی پاگل کہیں نہ ہو جائیں

زمانہ اپنی پریشانیوں میں کھویا ہے  
چلو کہ منزلِ جاناں کو دوستو جائیں

شبِ فراق تو کشتی نظر نہیں آتی  
خیالِ یار میں آؤں سراز سو جائیں

---



کچھ نہ کسی سے بولیں گے  
تہنائی میں روئیں گے

ہم بے راہ رُوحوں کا کیا  
ساتھ کسی کے ہوئیں گے

خود تو ہوئے رُسوا لیکن  
تیرے بھید نہ کھولیں گے

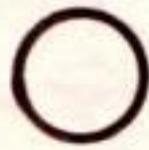
جیون زہر بھرا ساگر  
کب تک امرت گھولیں گے

ہجر کی شب سونے والے  
حشر کو آنکھیں کھولیں گے

پھر کوئی آندھی اٹھے گی  
پنپھی جب پڑ تو لیں گے

نیند تو کیا آئے گی فراز  
موت آئی تو سو لیں گے

---



سکوت بن کے جو نغمے دلوں میں پلتے ہیں  
وہ زخمِ رگِ جاں توڑ کر نکلتے ہیں

حضور آپ شب آرائیاں کریں لیکن  
فقط نمودِ سحر تک چراغِ جلتے ہیں

اگر فضا ہے مخالفت تو زلفِ لہراؤ  
کہ بادبانِ ہواؤں کا رخ بدلتے ہیں

کوئی بھی فیصلہ دینا ابھی درست نہیں  
کہ واقعات ابھی کروٹیں بدلتے ہیں

یہ پاس پیر مغاں ہے کہ ضعفِ تشنہ بی  
نش نہیں ہے مگر لڑکھڑا کے چلتے ہیں

خدا کا نام جہاں بیچتے ہیں لوگ فرآز  
بصد وثوق وہاں کاروبار چلتے ہیں

---

# صراف

ساٹھ کے تیس، نہیں یہ تو نہیں ہو سکتا  
زرِ خالص کی انگوٹھی ہے ذرا غور سے دیکھ  
کسی پتھر پہ رگڑ اس کو کسوٹی پہ پرکھ  
ہر طرح جاچنچ ہر انداز ہر اک طور سے دیکھ

مجھ پہ روشن ہے کہ اس جنس گراں مایہ کو  
میرے افلاس نے کم زرخ بنا رکھا ہے  
دیکھ کر میری نگاہوں میں طلب کی شدت  
تو نے انصاف کو نیلام چرٹھا رکھا ہے

جاننا ہوں تری دوکان کے یہ زریں زیور  
یہ گلو بند یہ گنگن یہ طلابی پیسے  
یہ زر و سیم کی اینٹوں سے لدی الماری  
کسی شہاد کا تابوت دھرا ہو جیسے

کتنے مجبوروں نے بڑھتی ہوئی حاجت کیلئے  
کیسے حالات میں کس نرخ یہاں بیچ دیئے  
کتنے ناداروں نے افلاس کے چکراؤ میں  
پہلے تو رہن کئے بعد ازاں بیچ دیئے

تیری میزاں کے یہ بے رحم سہرے پڑے  
ایک جلاد کی تلوار رہے ہیں اب تک  
گرسنہ آنکھوں کے کشکول ہوس کے مقتل  
ہرنئے خوں کے فریدارہے ہیں اب تک

ساڑھ کے تئیں نہیں، تئیں کے تیرہ دے دے  
اپنی مجبوری کا اظہار نہیں کر سکتا  
آج اک تلخ ضرورت ہے مرے پیشِ نظر  
میں کسی رنگ سے انکار نہیں کر سکتا

---

## منصور

وہ کیا خطا تھی؟

کہ جس کی پاداش میں ابھی تک

میں قرن ہا قرن سے شکارِ عبودیت

طوق درگلو— پایہ گل رہا ہوں

وہ جرم کیا تھا؟

کہ زندگی بھر تو میں

ترے آستاں پہ سجدوں کی نذر گزارتا رہوں

اور اس کا ثمرہ ملے

تو بس کاسہ گدا ئی — عذابِ عالم  
تو کیا مری بے طلب ریاضت، مجاہدت کا یہی صلہ ہے  
مجھے گلہ ہے

خدا نے تنور و آبِ سادہ مجھے گلہ ہے  
مجھے تری بندگی کے صدقے میں کیا ملا ہے  
کہاں ہے وہ تیرا دستِ فیاض  
جس کے جود و سخا کے قصے

سہرے حرفوں میں ہر صحیفے کے  
حاشیے بن کے رہ گئے ہیں  
کہاں ہیں وہ تیری جنتیں جن کی داستانیں  
بڑے تکلف سے عرش سے فرش پر اتاریں  
کہاں ہیں وہ تیرے شیر و شہد و شکر کے بے انتہا ذخیرے  
کہ جن کی کاذب جھلک سے تو نے  
گرسنہ مخلوق کو ازل سے غلام رکھا

کہاں ہیں ان داہمی کھلونوں کے  
اوپنچے بازار کس طرف ہیں

میں ان روایات کی حقیقت سے باخبر ہوں  
یہ سب وہ رنگین دام تھے جن کے بل پہ تونے  
زہیں پہ بغض و عناد و ظلم و فساد و حرص و ہوس کے ایسے دھوئیں اڑائے  
کہ نسل آدم کروڑ فرقوں میں بٹ گئی ہے  
یہ وحدہ لا شریک دنیا ہزار خطوں میں کٹ گئی ہے

اگرچہ روز الست سے لے کے اب تک  
بے شمار صدیوں کے فاصلے ہیں  
مگر یہ تاریخ کی کہن سال راہبہ، جو  
ترے کلیساؤں، بتکدوں اور حرم سراؤں کے مجرمانہ  
رموز سے آشنا رہی ہے  
ہر اک خرابے کی خاک اڑانے کے بعد آئی

تو کہہ رہی ہے

”سنوٹشیوں کے باسیو !

یہ جہاں تمہارا ہے

یہ زمیں، یہ فلک، یہ خورشید و ماہ و انجم فقط تمہارے ہیں

دوسرا ماسوا تمہارے کوئی نہیں ہے

خدا و بندہ کی تلخ تفریق بے حقیقت ہے بے سبب ہے

الوہیت کا وجود تم میں سے ہی کسی خود فریب انسان کا واہمہ تھا

یہ واہمہ اس قدر بڑھا پھر

کہ رفتہ رفتہ تمام کونین کا خداوند بن گیا ہے

اور اس خداوند

اس تصور کے آسرے پر

تمہارے کچھ ہم نفس رفیقوں نے

تم کو محکوم و پابہ زنجیر کر دیا ہے  
یہی وہ پہلا گناہ، پہلا فریب، پہلا فسوس ہے جس نے  
مزاجِ انساں کو غاصبانہ شعور بخشا “

اگر یہ سچ ہے !

اگر یہ سچ ہے خدائے تنور و آبِ سادہ  
تو یہ من و تو کی پست و بالا فضیل مسمار کیوں نہ کر دوں  
کہ ان مراتب کی کش مکش سے ہی

آج میں اور میرے ہم جنس

اس طرح ایک دوسرے کے غنیم ہیں

جس طرح زمستاں کی برف باری کے بعد گرجاں گرسنہ

بھوک کی شقاوت سے تنگ آ کر

اس ایک لمحے کے منتظر ہوں

جب ان کا کوئی نحیف سا مٹھی

غنودگی کا شکار ہو

اور سب کے سب اس پہ لوٹ کر چیر بھاڑ ڈالیں

کہ اس شکم کے مہیب دوزخ سے بڑھ کے

کوئی نہیں جہنم

نہ اس جہاں میں

نہ اس جہاں میں

## رباعی

مذہب کو مدام بیچتے ہیں یہ لوگ  
ایساں تو عام بیچتے ہیں یہ لوگ  
جنت کے اجارہ دار بن کر شب و روز  
اللہ کا نام بیچتے ہیں یہ لوگ

تھک جائیں گے راگیر چلتے چلتے  
ڈھل جائیں گے ماحول میں ڈھلتے ڈھلتے  
تاریکی شب میں نہ کمی آئے گی  
بجھ جائیں گے یہ چراغ جلتے جلتے

## مشورہ

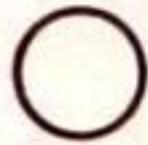
زیت کی تلخیوں سے گھبرا کر  
اپنا دامنِ عجز پھیلا کر  
آسماں کی طرف نگاہ کئے  
اپنے ربِّ کریم کے در سے  
موت کی بھیک مانگنے والے !  
دیکھ اس زرنگار مسجد کو  
آبِ زرّیں کی جھلملاہٹ سے  
جہاں کے مینار جگمگاتے ہیں

تیرے ربِ کریم کا گھر ہے  
اور اس خانہ مقدّس میں  
مے کو شرکے خم لٹھائے ہوئے  
شوخی غلماں لگائے سینے سے  
ملک الموت نیم خوابیدہ  
یا ربِ کریم میں گم ہیں

چھوڑ انداز یہ دعاؤں کا  
تا بہ کئے آسرا خداؤں کا  
ہاں فقط ایک نعرہ وحشت  
بڑھ فقط اک قدم بغاوت کا  
یا تو یہ خیر و شر کے رکھوالے

موت کی بھیک تجھ کو دے دیں گے  
یا پھر ان کے مہیب پنجوں سے  
پھین کر اپنی زندگی پالے  
موت کی بھیک مانگنے والے

---



غیر سے تیرا آشنا ہونا  
گویا اچھا ہوا بُرا ہونا

خود نگوں سار، ہمسفر بیزار  
اک ستم ہے شکستہ پا ہونا

کتنی جانتکاہ ہے ضمیر کی موت  
کتنا آساں ہے بے وفا ہونا

نشہ لذتِ گناہ کے بعد  
سخت مشکل ہے پارسا ہونا

آدمی کو خدا نہ دکھلائے  
آدمی کا کبھی خدا ہونا

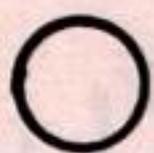
دل کی باتوں پہ کون جائے فراز  
ایسے دشمن کا دوست کیا ہونا

---

## رباعی

روتا ہوں تو احباب بُرا مانتے ہیں  
ہنستا ہوں تو مجرم مجھے گردانتے ہیں  
ہر حال میں اعتراض کرنے والے  
ناداں مئے حالات کہاں جانتے ہیں

زہر اب حیات چکھ رہا ہوں دیکھو  
کانٹوں پہ زبان رکھ رہا ہوں دیکھو  
واقف ہوں طبیعتوں سے انکی پھر بھی  
احباب کے دل پر رکھ رہا ہوں دیکھو



تیرے ہوتے ہوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ  
لوگ کیا سادہ ہیں سورج کو دکھاتے ہیں چراغ

اپنی محرومی کے احساس سے شرمندہ ہیں  
خود نہیں رکھتے تو اوروں کے بجاتے ہیں چراغ

بستیاں دور ہوئی جاتی ہیں رفتہ رفتہ  
دمبدم آنکھوں سے پھپھتے چلے جاتے ہیں چراغ

کیا خبر اُن کو کہ دامن بھی بھر دک اُٹھتے ہیں  
جو زمانے کی ہواؤں سے بچاتے ہیں چراغ

گو سیہ بخت ہیں ہم لوگ پر روشن ہے ضمیر  
خود اندھیرے میں ہیں دُنیا کو دکھاتے ہیں چراغ

بستیاں چاند ستاروں کی بسانے والو  
کرہ ارض پہ بجھتے چلے جاتے ہیں چراغ

ایسے بیدرد ہوئے ہم بھی کہ اب گلشن پر  
برق گرتی ہے تو زنداں میں جلاتے ہیں چراغ

ایسی تاریکیاں آنکھوں میں بسی ہیں کہ فراز  
رات تو رات ہے ہم دن کو جلاتے ہیں چراغ

# آگ میں پھول

میں تو شعلوں کا پجاری ہوں مے پاس نہ آ  
اپنے دامن میں محبت کے حسین پھول لئے  
ان دلاویز بہاروں سے مجھے ربط نہیں

جب کوئی تازہ کلی نکہت و رنگت کی پہلی  
شبِ بنی حسن کے سیمین لبائے اوڑھے  
مست پلکوں پہ لئے صبحِ جوانی کی پھوار  
میرے تپتے ہوئے ماحول میں درآتی ہے

تو مرے سر و ارادوں سے دُھواں اُٹھتا ہے  
میری آنکھوں میں الاؤ سے دہک جاتے ہیں  
اور اس آتش و ظلمت کے گھنے لائے میں  
مسکراتی ہوئی شاداب کلی کی سانسیں  
چند ہی لمحوں میں رُک جاتی ہیں بھک جاتی ہیں  
تو کہ تو بھی ہے کسی ذوقِ نو سے سرشار  
مست پیکوں پہ لے صبح جوانی کی پھوار

ایک انجان سی منزل کو بڑھے آتی ہے  
دیکھ اس شعلوں کی بستی کو ذرا غور سے دیکھ  
ہر قدم پر جہاں انگارے ہی انگارے ہیں  
تو یہاں رہ کے کبھی پھول نہیں بن سکتی  
لوٹ جا پیشتر اس کے کہ ترے ہونٹوں میں

احمیں رس کی جگہ تند شرر گھل جائیں  
ان مہکتے ہوئے رخساروں کے زرخیز کنول  
اگ کے حلقہ بے باک میں جھلسے جائیں

میں تو شعلوں کا پجاری ہوں.....

---

## رباعی

حالات کی دوپہر کڑی ہے ساقی  
تقدیر برہنہ سر کھڑی ہے ساقی  
کچھ دیر عیشم جہاں پہ مہنس لیں آؤ  
رونے کو تو زندگی پڑی ہے ساقی

دُنیا تو ہے کانٹوں کا بچھونا پیارے  
تم ہم سے کبھی جُدا نہ ہونا پیارے  
اُدھل کر دکھ کے لمحے کاٹیں  
اک جتن ہے ساتھ ساتھ رونا پیارے

بڑھ جاتا ہے دل کا روگ گاہے گاہے  
کر لیتے ہیں اپنا سوگ گاہے گاہے  
جو یاد دلا دیتے ہیں بھولے صدے  
مل جلتے ہیں ایسے لوگ گاہے گاہے

---



میری حالت ہے کہ احساسِ طرب ہے کوئی  
تیرے بے ساختہ ہنسنے کا سبب ہے کوئی

فتنہ گردشِ دوراں ذرا آہستہ گزر  
سایہ زلف میں آرام طلب ہے کوئی

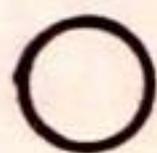
اپنے رونے کا سبب تو نہیں معلوم مگر  
لوگ کہتے ہیں کہ تقریبِ طرب ہے کوئی

آج تک ان سے رہ و رسم چلی جاتی ہے  
جن سے کچھ پہلے توقع تھی نہ اب ہے کوئی

یا تجھے دیکھ کے بھر آئے خوشی سے آنسو  
یا مری آنکھوں میں گزری ہوئی شب ہے کوئی

جانے کن لوگوں کی بستی میں چلے آئے فرار  
آبدیدہ ہے کوئی خندہ بلب ہے کوئی

---



اب جو کانٹے ہیں دل میں تمناؤں کے پھول تھے  
آج کے زخم پہلے شناساؤں کے پھول تھے

دشتِ غربت کچھ ایسا ہوا گلنشاں گلنشاں  
جس طرح پھوٹتے آبلے پاؤں کے پھول تھے

تھی ہمیں کو بہت خار زار جنوں کی لگن  
دوستو! ورنہ اقوال داناؤں کے پھول تھے

غم کی لو سے دھڑکتے دلوں کے کنول بچھ گئے  
دُھوپ میں کیسے کھلتے وہ جو چھاؤں کے پھول تھے

برف زاروں میں کوئی اگر یہ سماں دیکھتا  
جا بجا نقشِ پاکوہ پیماؤں کے پھول تھے

شہر میں حسنِ سادہ کو کانٹوں میں تو لا گیا  
بک گئے کوڑیوں مول جو گاؤں کے پھول تھے

زہر آگیاں فضا بستیوں کی جنہیں کھا گئی  
ہم فرآز ایسے سنان صحراؤں کے پھول تھے

---



سکوتِ شامِ خزاں ہے قریب آ جاؤ  
بڑا اداس سماں ہے قریب آ جاؤ

نہ تم کو خود پہ بھروسہ نہ ہم کو زعمِ وفا  
نہ اعتبارِ جہاں ہے قریب آ جاؤ

رہِ طلب میں کسی کو کسی کا دھیان نہیں  
ہجومِ ہمسفراں ہے قریب آ جاؤ

جو دشتِ عشق میں بچھڑے وہ عمر بھر نہ ملے  
یہاں دُھواں ہی دُھواں ہے قریب آ جاؤ

یہ آندھیاں ہیں تو شہرِ وفا کی خیر نہیں  
زمانہ خاک نشاں ہے قریب آ جاؤ

فقیہ شہر کی مجلس نہیں کہ دور رہو  
یہ بزمِ پیرِ معاں ہے قریب آ جاؤ

فرازِ دُور کے سُورج غروب سمجھے گئے  
یہ دُورِ کم نظراں ہے قریب آ جاؤ

## رباعی

ہر بحرِ ستم کو پاٹ لینے والا  
ہر زہرِ الم کو چاٹ لینے والا  
ذرتے سے پناہ ڈھونڈتا پھرتا ہے  
انساں پہاڑ کاٹ لینے والا

اشوب کہہ حیات لے ڈوبیں گے  
دنیا کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبیں گے  
ہم لوگ عبارت ہیں زمانے جن سے  
ڈوبیں گے تو کائنات لے ڈوبیں گے

# جانشین

(۱۹۵۲ء میں کراچی میں طلباء پر فائرنگ سے متاثر ہو کر لکھی گئی)

علم و دانش کے سوداگروں نے کہا  
جاہلو!

تم اندھیروں کی دُنیا کے باسی  
جہالت کی تاریک غاروں کے مُردے

کہاں جا رہے ہو، کہاں؟

تم تہی دست ہو

تم تہی جیب ہو

تم تہی دامنوں سے ہمیں کوئی لالچ نہیں

تم نہیں جانتے

تم نہیں مانتے

ہم تمہارے لئے

کب سے تہذیب و حکمت کی نایاب اجناس کو

منڈیوں میں سجاٹے ہوئے ہیں

تم نہیں دیکھتے

تم کہ شب کو رہو

ہم نے دن کے اُجالے میں بھی بس تمہارے لئے

اس تمدن کے فانوس روشن کئے

جن کی شفاف کرنوں سے سارا جہاں بقعہ نور ہے

عالم طور ہے

پاگلو!

تم نہیں جانتے

تم نہیں مانتے

ہم ارسطو ہیں شاہوں کے استاد ہیں  
ہم فلاطوں ہیں ہم کو ہراک علم و حکمت کے گریاد ہیں

ہم ہی سقراط ہیں

ہم ہی بقراط ہیں

ہم ہی بے مثل شخصیتوں کے فرد مند فرزند ہیں

ہم ہی کون و مکاں کے خداوند ہیں

سر پھرو !

تم کو ہم سے گلہ ہے کہ ہم نے تمہیں

خاک و خون کے سمندر میں نہلا دیا

صرف اپنے تسلط کی خاطر تمہیں

ہم نے انہوں کے ہاتھوں سے کٹوا دیا

چاند سُورج تو اپنے لئے رکھ لئے  
اور تم کو کھلونوں سے بہلا دیا  
تم کو اس کی مگر کچھ خبر ہی نہیں  
یہ تسلط یہ جاہ و چشم یہ زمین  
بس تمہارے لئے ہے تمہارے لئے  
دورِ فردا کے فرما نرودا ہو تمہیں  
تم کو ہونا ہے اجداد کا جانشین  
پاگلو !

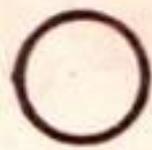
ہم سے عالی نظر دیدہ ور  
تم سے جو بھی کہیں مان لو  
اپنے اپنے مرا تپ کو پہچان لو  
تم نہیں جانتے . تم کہ مردہ رہے سال ہا سال سے  
بھیرلوں اور درندوں کی ارواح بد تم میں در آئی ہیں

اور جہل و جنوں کی نجس مشعلیں دے کے تم کو  
بغاوت پہ اکساتی ہیں

اپنے اجداد سے۔ اپنے فرما تراؤں سے آقاؤں سے

جاہلو!

پاگلو!!



راتیں ہیں اُداس دن کرٹے ہیں  
اے دل ترے حوصلے بڑے ہیں

اے یادِ جیب ساتھ دینا  
کچھ مرحلے سخت آ پڑے ہیں

رُکنا ہو اگر تو سو بہانے  
جانا ہو اگر تو راستے بڑے ہیں

اب کیسے بتائیں وجہِ گریہ  
جب آپ بھی ساتھ رو پڑے ہیں

اب جانے کہاں نصیب لے جائے  
گھر سے تو نِراز چل پڑے ہیں

---

# سیلاب

پھر تم ہاتھوں کو پھیلاؤ      آیا ہے سیلاب  
ناچو گاؤ جشن مناؤ      آیا ہے سیلاب

قدرت کے سب کھیل نیاے

اس میں کسی کو دخل نہیں ہے

جس کو ڈبوئے جس کو اُبھائے

چھوڑو ناؤ خوف نہ کھاؤ      دُور نہیں گرداب

ناچو گاؤ جشن مناؤ      آیا ہے سیلاب

کٹیادوں کو بہہ جانے دو

مال مویشی سب کچھ چھوڑو

نام خدا کا رہ جانے دو

ہاتھ اٹھاؤ ڈوبے جاؤ چھوڑو مال اسباب

ناچو گاؤ جشن مناؤ آیا ہے سیلاب

پھٹے پرانے کپڑے پہنو

اپنا مقدر۔ اپنا نصیب

دیکھتی جاؤ۔ ننگی بہنو

ننگی ماؤ۔ بُنتی جاؤ اطلس اور کھنواں

ناچو گاؤ جشن مناؤ آیا ہے سیلاب

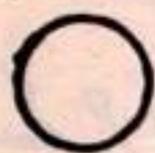
تم ہو جیون بھر کے روگی

یہ جگ چھوڑو اُس دُنیا میں

تم پہ خدا کی رحمت ہوگی

پھول اگاؤ پتھر کھاؤ گندم ہے نایاب  
ناچو گاؤ جشن مناؤ آیا ہے سیلاب  
منس منس کر کے غربت زادو  
ان داناؤں کے چرنوں میں  
اپنی جائیں بھینٹ چرٹھا دو  
بڑھتے آوروں گ مٹاؤ ہو جاؤ عسرتاب  
ناچو گاؤ جشن مناؤ آیا ہے سیلاب

---



لے اڑا پھر کوئی خیال ہمیں  
ساقیا ساقیا سنبھال ہمیں

روہے ہیں کہ ایک عادت ہے  
ورنہ اتنا نہیں ملال ہمیں

خلوتی ہیں ترے جمال کے ہم  
آئینے کی طرح سنبھال ہمیں

مرگِ انبوہ جشنِ شادی ہے  
مل گئے دوست حسبِ حال ہمیں

اختلافِ جہاں کا رنج نہ تھا  
دے گئے مات ہم خیال ہمیں

کیا توقع کریں زمانے سے  
ہو بھی گرجراتِ سوال ہمیں

ہم یہاں بھی نہیں ہیں خوش لیکن  
اپنی محفل سے مت نکال ہمیں

ہم ترے دست ہیں فرازِ مگر  
اب نئی ابجھنوں میں ڈال ہمیں



ہم ہیں ظلمت میں کہ اُبھرا نہیں خورشید اب کے  
کوئی کرتا ہی نہیں رات کی تردید اب کے

کون سُنتا تھا حدیثِ غمِ دل یوں تو مگر  
ہم نے چھڑی ہے ترے نام سے تمہید اب کے

پی گئے رند کہ نایاب ہے صہبِ ورنہ  
زہر تھی محتسبِ شہر کی تنقید اب کے

تشنگی وجہ جنوں ہے تو چلو یوں ہی سہی  
کوئی سنگ آٹے ہر ساغر جمشید اب کے

اک زمانے سے نہ روئے ہیں نہ جاں تڑپی ہے  
دل پہ لازم ہے ترے درد کی تجدید اب کے

قصہ اہلِ وفا جانے کہاں تک پہنچے  
منزلِ دار و رسن مٹھری ہے تمہید اب کے

لہو روئے ہیں تو گلنار شفق پھوٹے گی  
آنسو بوائے ہیں تو ہم کاٹیں گے خورشید اب کے

ہم نے یہ سونج کے جاں دی ہے محبت میں فراز  
بوا ہو کس کرتے ہیں کس رنگ میں تقلید اب کے

۲۳ مارچ

(جشن جمہوریہ پاکستان کے موقع پر لکھی گئی)

”خوشایہ ساعتِ زنگیں خوشایہ روزِ طرب  
ستم کشو! نئی منزل کا احترام کرو  
اُداس چہروں سے گردِ ملال دھو ڈالو  
ملول رُوحوں کو ہنس ہنس کے شاد کام کرو  
دردِ خانہ گھنی ظلمتیں سہی لیکن  
بڑے خلوص سے تزیینِ سقف و بام کرو  
چراغ ہوں کہ لہو ہو کہ آنسوؤں کی لہجہ  
پھر آج جشن بہاراں کا اہتمام کرو

شبِ الم کی حکایات کا یہ وقت نہیں  
اُٹھو اور اُٹھ کے نئی صبح کو سلام کر دو

امیرِ شہر کے فرمان سب بجا لیکن  
فقیرِ شہر بھی کچھ عرضِ حال کرتے ہیں  
خطا معاف بصد احترام عہدِ وفا  
سکتے ہونٹ دکھے دل سوال کرتے ہیں  
کہ ہم تو وہ ہیں جو بادِ صفِ صنعِ تشنہ بسی  
مزاج پیرِ مغان کا مسلال کرتے ہیں  
ہر ایک تیر کو خوش آمدید کہتے ہوئے  
دو چند اہلِ حشم کا جلال کرتے ہیں  
ہمیں تو جاں سے زیادہ عزیزِ دروِ وطن  
مگر حضور بھی ایسا خیال کرتے ہیں

چمن میں جشنِ درودِ بہار جب بھی ہوا  
دطن میں جب بھی فروزاں ہوئے خوشی کے دیے

رہی ہے بوالہوسوں کے سب میں بادۂ ناب  
بلاکشانِ دفا نے لہو کے گھونٹ پیئے

مہ و نجوم رہے بزمِ شہرِ یاراں میں  
نگاہِ خلقِ ترستی رہی کرن کے لئے

ادھر عب و تبا کا خیال دامن گیر  
ادھر یہ نگر کہ کوئی جگر کے چاک سیئے  
تو کیا یہی غمِ جمہور کے تقاضے ہیں  
نظر اٹھا کے نہ دیکھیں کوئی مرے کہ جسے

نہے نصیبِ جواب بھی غمِ مائل ہے  
یہ دورِ نو ہے مبارک اگر سنجھل کے چلیں

یہ چند سالوں کی فرصت بڑی غنیمت ہے  
کسے خبر ہے کہ پھر حادثے ٹلیں نہ ٹلیں  
خدا وہ وقت نہ لے لے کہ گردشوں کے طفیل  
حضورِ اپنی جفاکشیوں پہ ہاتھ ملیں  
جو ہو سکے تو مٹا دیں یہ فاصلے ورنہ  
کہیں یہ ذرے ساروں سے انتقام نہ لیں  
بجھے ہوں دل تو اندھیرے کبھی نہیں مٹتے  
یہ مٹتے تو کجا لاکھ آفتاب جلیں

---



دل کو اب یوں تڑی ہر ایک ادا لگتی ہے  
جس طرح نشے کی حالت میں ہوا لگتی ہے

رتجگے خواب پریشاں سے کہیں بہتر ہیں  
لرز اٹھتا ہوں اگر آنکھ ذرا لگتی ہے

اے رگِ جاں کے مکھیں تو بھی کبھی غور سے سُن  
دل کی دھڑکن ترے قدموں کی صدا لگتی ہے

گو دکھی دل کو بہت ہم نے بچایا پھر بھی  
جس جگہ زخم ہو واں چوٹ سدا لگتی ہے

شاخ اُمید پہ کھلتے ہیں طلب کے غنچے  
یا کسی شوخ کے ہاتھوں میں حنا لگتی ہے

تیرا کہنا کہ ہمیں رونق محفل ہیں سراز  
کو تسلی ہے مگر بات خدا لگتی ہے

---



ہم اپنے آپ میں گم تھے ہمیں خبر کیا تھی  
کہ ماورائے غنم جاں بھی ایک دُنیا تھی

وفا پہ سخت گراں ہے ترا وصالِ دوام  
کہ تجھ سے مل کے بچھڑنا مری تمتا تھی

ہوا ہے تجھ سے بچھڑنے کے بعد اب معلوم  
کہ تو نہیں تھا ترے ساتھ ایک دُنیا تھی

خوشا وہ دل جو سلامت رہے بزعم وفا  
نگاہِ اہل جہان در نہ سنگِ خارِ محقق

دیارِ اہل سخن پر سکوت ہے کہ جو ہفت  
نہراز میری غزل بھی صدا بصرِ محقق

---

# تفاوت

تو کیوں ہے اُداسن مسکرا دے  
کیوں تجھ کو غم و فانی گھیرا  
زنگارِ الم سے دُور ہی رہ  
آئینہ صفت جمال تیرا  
کتنی ہی سیاہ شب ہو لیکن  
کب چاند پرچھا سکا اندھیرا  
کب موجِ رُشنی تھمی ہے  
دریاؤں پہ دُھول کب جمی ہے

میں کیسے ہنسوں کہ دردِ ہستی  
ہے میرے شعور کا تقاضا  
حالات کی دُھوپ میری قسمت  
آلام کی ریگ میری دُنیا  
میں سایہ نخل کو بھی ترسوں  
صحرا کی طرح وجودِ میرا  
صحراؤں میں پھول کب کھلے ہیں  
ہم دونوں میں کتنے فاصلے ہیں

---



اب تک تیرے فتنے میں سلامت اُسے کہنا  
یارو ! سر محشر بھی قیامت اُسے کہنا

اے مہنفسو محوِ غم جاں میں ابھی ہم  
آئیں گے سر کوئے ملامت اُسے کہنا

معیارِ نظر دار کی رفعت بھی تھی لیکن  
بھولا نہیں تیرا قد و قامت اُسے کہنا

اک وہ ہی نہیں ترکِ تعلق پہ پشیمان  
ہے اہلِ وفا کو بھی ندامت اُسے کہنا

اے دل زدگیاں! موت ہے اظہارِ تمنا  
وہ بُت ہو خدا بھی تو خدامت اُسے کہنا

ہر چند فرآز ان دنوں معنوب ہے پھر بھی  
حالات کا مارا ہے بُرامت اُسے کہنا

---

# تسل

کب سے سسنان خرابوں میں پڑا تھا یہ جہاں  
کب سے خوابیدہ تھے اس ڈاری خار کے صنم  
کس کو معلوم یہ صدیوں کے پراسرار بھرم  
کون جانے کہ یہ پتھر بھی کبھی تھے انساں  
صرف لب و ختہ پر بت ہوں جہاں لوح کناں

نہ دیو بام نہ دیوار و دریچہ کوئی  
کوئی دہلیز شکستہ نہ حریم ویراں

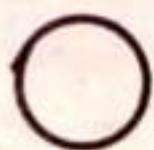
شہر کے شہر ہیں پاتال کے دامن میں نہاں  
کون پہچانتا ظلمت میں سیاہی کے نشاں  
جو نظر ڈھونڈھنے اٹھی وہ نظر بھی کھوئی  
چشم مہتاب بھی شبنم کی جگہ خوں روئی

یہ خرابے تھے ان ادوار کے مدفن جن میں  
ارضِ مشرق کے جہاں تاب اُجالوں کی نمود  
جگمگاتی رہی تاریخ کا تاریک وجود  
رات ہوتی رہی تبدیل چمکتے دن میں  
ان گنت صدیوں کی تہذیبِ بی تھی ان میں

علم نے آج کر دیے ہیں وہ ظلمات کے ڈھیر  
وقت نے جن پہ بٹھائے تھے فنا کے پہرے  
جاگ اٹھے صورِ سراپیل سے گونگے بہرے

تا ابد جن کے مقدر میں تھی دُنیا اندھیر  
یہ مگر عظمتِ انساں ہے کہ تقدیر کے پھیر؟

یہ عمارات، یہ مینار، یہ گلزار، یہ کھیت  
تو دہ خاک سے ہستی نے لیا تازہ جنم  
جی اُٹھے وادیِ خاموش کے بے جان صنم  
پھر کوئی پیرے کا ذرے کا جگر قطرہ یم  
دفن کر دے گا جو خالق کو بھی مخلوق سمیت



چاندنی رات کو سحر کہنا  
دوستو! یوں نہیں مگر کہنا

اب کہاں وہ بہار پھولوں کی  
گلِ نرگس کو چشمِ تر کہنا

بجھ چکے ہیں محبتوں کے چراغ  
ان دیاروں کو اب کھنڈ کہنا

راہ میں لٹ کے بیٹھنے والو  
اب کسی کو نہ ہمسفر کہتا

خود اُجاگر کر دو، مہنر اپنا  
دوسروں کو نہ کم نظر کہتا

ق

ہم کو آوارگی کے پردے میں  
دل کی باتیں ادھر ادھر کہنا

ذکر تیسرا گلی گلی کرنا  
حال اپنا نگر نگر کہنا

لب گویا عذابِ جاں ہے فراز  
جو بھی کہتا ہو سوش کر کہنا

# ہلالِ عید

ہلالِ عید ! نویدِ طرب ہے دید تری  
تری نمودِ خوشی کا پیام لاتی ہے  
بجھی نگاہوں میں کرنوں کی جوت پھرتی ہے  
مولِ رُوحوں کی انسِ دگی مٹاتی ہے  
روانتیں ہیں کہ اس دن ہر ایک دل کی کلی  
دفورِ نشہِ راحت سے جھوم جاتی ہے  
بلند و پست کے ہر تفرقے مٹاتے ہوئے  
ہر اک محل میں ہر اک گھر میں عید آتی ہے

ہلالِ عید! مگر میں نے ہر برس دیکھا  
کہ تیری ضو بھی نشیبوں میں مسکراتی نہیں  
روایتوں پہ مجھے بھی یقین تو ہے لیکن  
یہ خوش عقیدگی کیا کیجے اس آتی نہیں  
خدا کے گھر میں برابر سہی عزیز و غنی  
یہ رسم ملکِ خدا میں رواج پاتی نہیں  
طلوع ہوتا رہا تو ہر اک سال مگر  
مرے دطن کی جہیں پھر بھی جگمگاتی نہیں

ہلالِ عید! ثقافت کی آتشیں آندھی  
بھلسن ہی ہے میرے دلیں میں خوشی کے چمن  
کہیں تو جسم پہ ریشم کے ڈھیر بارِ نظر  
کہیں بدن پہ ہیں عریانیاں ہی پیراہن

کہیں تو کجکلاہی وجہِ نخوت و تمکین  
کہیں فلاکتِ افلاسِ زندگی کے کفن  
کہاں وہ دن کہ غریبِ الدیار روتے تھے  
یہ حال ہو تو وطن میں ستم ہے عیدِ وطن

ہلالِ عید! تجھے غمزدوں سے کیا نسبت  
کہ خواجگانِ جہاں ہی ترے چہیتے ہیں  
جو تیرے نام کے ساغرِ فضا میں لہرا کر  
تیری بھمان کی قوسوں کو موڑ دیتے ہیں  
فغاں! کہ تجھ کو بھی ان بے کسوں سے ربط نہیں  
جو اپنے دل کے سفینے لہو میں کھیتے ہیں  
تیری ضیا بھی ہے گویا کٹی پتنگ جسے  
بلند بامِ خلا ہی میں لوٹ لیتے ہیں

ہلالِ عید! طربِ زاہی یہ شامِ مگر  
چراغِ شوقِ جلاتے ہوئے لڑتے ہیں  
دلوں پہ کل جو قیامت گزرنے والی ہے  
اب اس کا دھیان بھی لاتے ہوئے لڑتے ہیں  
ہم اہلِ غم تجھے خوش آمدید کیسے کہیں  
جو اپنے دکھ بھی سناتے ہوئے لڑتے ہیں  
اگرچہ تجھ پہ نگاہیں جمی ہوئی ہیں مگر  
دعا کو ہاتھ اٹھاتے ہوئے لڑتے ہیں

---



جانے کس غم سے من سلگتا ہے  
بات کرتے دھن سلگتا ہے

غم لگاتا ہے آگ خلوت میں  
دل سرِ انجمن سلگتا ہے

اگر میں جسم آپنخ دیتا ہوا  
جس طرح پیسہ بن سلگتا ہے

یہ طلب ہے کہ دردِ محرومی  
ابر چھائے تو بن سکتا ہے

دیکھنا لو چلی کہ با مُراد  
دوستو پھر چمن سکتا ہے

جاگ اٹھی خواہشِ گناہِ فرار  
چاندنی میں بدن سکتا ہے

---

## واہمہ

تو ہر ایک بات پہ منہس دیتی ہے  
اور میں سوش میں پڑ جاتا ہوں  
یہ تری سادہ و معصوم ہنسی  
آنکھ کی بھول سماعت کا فسوں  
تیری عادت ترا انداز نہ ہو  
بے تکلف ترے ہونٹوں کی چٹک  
میری خوش منہی کا اعجاز نہ ہو  
میں سراپوں کو بھی دریا سمجھوں  
تو فقط شوق کی پرداز نہ ہو

تو ہر اک بات پہ منہں دیتی ہے  
اور میں سوشج میں پڑ جاتا ہوں  
یہ تری سادہ و بے باک ہنسی  
میں جسے خواب سے تعبیر کروں  
وہ حقیقت میں کوئی راز نہ ہو  
تیرے بے ساختہ ہنسنے کی ادا  
تیری تنہائی کی آواز نہ ہو  
میں جسے حسن طبیعت جانوں  
تیرے جذبات کی غماز نہ ہو

تو ہر اک بات پہ منہں دیتی ہے  
اور میں سوشج میں پڑ جاتا ہوں  
یہ تیری سادہ و پرکار ہنسی  
میری دُنیا مری ہستی کا سکوں

کسی طوفان کا آغاز نہ ہو  
میں محبت کی طلب کا مارا  
تو فقط حسن نظر باز نہ ہو  
یہ نہ ہو میں تو سو مبرجیتوں  
اور ترے قصر کا در باز نہ ہو

---

## ایک شعر

جسم بلور سا نازک ہے جوانی بھر پور  
اب کے انگڑائی نہ ٹوٹی تو بدن ٹوٹے گا

یہ میں یہ کوئے دارِ یہ تہائی دوستو  
کیا تم بھی بن گئے ہوتا شائی دوستو

پیغامِ مرگ ہے کہ پیامِ حبیب ہے  
صرصر چلی کہ بادِ مراد آئی دوستو

یہ کیا کہ ایک تیرِ ملامت نہ بہہ سکے  
ہونی ہے کو بکو ابھی رسوائی دوستو

آغازِ شامِ ہجر ہے بیٹھے رہو ابھی  
ٹھہرو ذرا کہ موت ہے تنہائی دوستو

زنجیر کٹ گئی کہ کوئی دوست کٹ گیا  
کچھ تو کہو یہ کیسی صدا آئی دوستو

اک بار اس کو میری نگاہوں سے دیکھ لو  
پھر خود کہو کہ کون ہے سودا ئی دوستو

وہ حسن و لفرور کہ جانِ فراز ہے  
خلقِ خدا ہے اس کی تمنائی دوستو

# کنیز

حضور آپ اور نصف شب مے مکان پر  
حضور کی تمام تر بلائیں میری جان پر  
حضور خیریت تو ہے حضور کیوں خموش ہیں  
حضور بولنے کہ دسو سے وبال ہوش ہیں  
حضور ہونٹ اس طرح سے کپکپا رہے ہیں کیوں  
حضور آپ ہر قدم پہ لڑکھڑا رہے ہیں کیوں  
حضور آپ کی نظر میں نیند کا خمار ہے  
حضور شاید آج دشمنوں کو کچھ بخار ہے

حضور مسکرا رہے ہیں میری بات بات پر  
حضور کو نہ جانے کیا گماں ہے میری ذات پر  
حضور منہ سے بہہ رہی ہے پیک صاف کیجئے  
حضور آپ تو نشے میں ہیں معاف کیجئے  
حضور کیا کہا میں آپ کو بہت عزیز ہوں  
حضور کا کرم ہے ورنہ میں بھی کوئی چیز ہوں

حضور چھوڑیئے ہمیں ہزار اور روگ ہیں  
حضور جانیئے کہ ہم بہت غریب لوگ ہیں

---

## آتشِ عجم

شبِ سیہ کے اُڈتے ہوئے اندھیروں میں  
دل و نظر نے امیدوں کے کتنے خواب بُنے  
خرد کے ہاتھ میں جب آخری چراغ بجھا  
جنوں نے عزم کے ذروں سے آفتاب چھنے

ہوس کی تیرہ نگاہوں کے رینگتے سائے  
بڑھے تو بجھے شراروں نے آگ برسانی  
فضا نے جب بھی ارادہ کیا کچلنے کا  
تو ڈوبتی ہوئی نبضوں میں برق لہرائی

خیال تھا کہ اگر تند آندھیاں بھی اٹھیں  
تو ذرے سُرخ بگولوں کا رُوپ لے لیں گے  
ہزار بادِ مخالف کا زور ہو لیکن  
سفینے شدتِ طوفاں کو مات دے دیں گے

حیات دست و گریباں ہوئی قضا سے مگر  
ہزار سانپ نکل آئے آستینوں سے  
بہت قریب تھی ساحل کی روشنی لیکن  
سفینے جھوم کر ٹکرا گئے سفینوں سے

اس اختلافِ بہم کی کڑی کشاکش میں  
وہ دلوں کے وہ شرر سرد ہو گئے آخر  
وہ ذرے جن کو فضاؤں میں رقص کرنا تھا  
بگولے بن نہ سکے گرد ہو گئے آخر

یہ ہیں ہمہ نہ رُسکے گی اس انقلاب کی رو  
اس انقلاب کی ضو تیرگی مٹائے گی  
جو آگ تیل کے چشموں کو چھو کے گزری ہے  
سمندروں کی تہوں کو بھی چیر جائے گی

---

احمد فراز کی

دیگر تصانیف

— جاناں جاناں

— درد آشوب

— نایافت

— شبِ خون

— میرے خواب ریزہ ریزہ